BROWN
BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222753
UNIVERSAL
LIBRARY

گلشن ہند

CHECKED 1951

مشہور شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ

جس کو

CHECKED 1966 Checked 1969.

میرزا علی متخلّص بہ لطف

نے، بعہد مارکوئس آف ویلزلی گورنر جنرل ہند، اُردو کے مشہور سرپرست مسٹر جان گلگرسٹ کی فرمائش سے، علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ گلزار ابراہیم سے، مع اضافوں کے اُردو زبان میں، جو آج سے ایک سو پانچ برس پیشتر کی سادہ اُردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے،

سنہ ۱۸۰۱ء

میں تصنیف کیا، اور

سنہ ۱۹۰۶ء

میں

شمس العلما مولوی شبلی کی تصحیح و تحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے

کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ، اُردو زبان کی خدمت کے لئے

عبداللہ خاں نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا

اور

دارالاشاعت پنجاب

کے

رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپا

جملہ حقوق بذریعہ رجسٹری محفوظ ہیں۔

ڈیڈی کیشن

ہز ایکسیلنسی مہاراجہ یمین السلطنتہ
بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ کو چوں کہ
اُردو زبان سے ایک خاص دلچسپی
ہے، اور آپ خود بھی اُردو زبان کے
ایک ممتاز مصنّف اور بلند پایہ شاعر
ہیں، لہذا یہ کتاب جناب کے نام
نامی پر ڈیڈیکیٹ کی جاتی ہے
گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خاکسار
عبد اللہ خاں حیدر آباد دکن

فہرست تذکرہ گلشن ہند

مضامین	نمبر صفحہ	مضامین	نمبر صفحہ
پبلشر کی التماس	۱-۲	بقا، محمد بقا	۵۸
مقدمہ، ازمولوی عبدالحق صاحب بی-اے	۱-۲۴	بیدار، میر محمدی	۵۹
دیباچہ مصنف	۱-۶	بسمل، سید جبار علی	۶۳
باب الف	۶-۵۲	**باب التاء**	۶۵-۷۱
آفتاب، شاہ عالم بادشاہ غازی	۶	تاناشاہ، ابوالحسن والی گولکنڈہ	۶۵
آصف، نواب آصف الدولہ وزیر اودھ	۱۲	**باب الجیم**	۷۱-۸۱
انجام، عمدۃ الملک نواب امیر خاں	۱۶	جہاندار، میرزا جواں بخت، ولی عہد شاہ عالم	۷۱
اُمید، میرزا محمد رضا	۱۷	جرأت، شیخ قلندر بخش	۷۳
آرزو۔ سراج الدین علی خاں	۲۳	جوشش، شیخ محمد روشن	۷۶
آبرو۔ شاہ نجم الدین	۲۵	**باب الحاء**	۸۱-۹۷
احسن، میرزا احسن	۲۸	حاتم، شیخ ظہور الدین	۸۱
الہام، شیخ شرف الدین	۲۹	حزین، میر باقر	۸۳
اثر، میر محمد	۳۰	حسرت، میرزا جعفر علی	۸۴
الم، صاحب میر	۳۲	حیران، میر حیدر علی	۸۵
اشتیاق، شاہ ولی اللہ	۳۳	حسرت، ہیبت قلی خاں	۸۶
انشاء، میر انشاء اللہ خاں	۳۵	حسن، خواجہ حسن	۸۹
امانی، میر امانی	۳۷	حسن، میر غلام حسن	۹۳
امین، خواجہ امین الدین	۴۰	**باب الخاء**	۹۷-۹۸
افسوس، میر شیر علی	۴۷	خاکسار، محمد یار	۹۷
آشفتہ، حکیم رضا قلی خاں	۵۰	**باب الدال**	۹۸-۱۰۳
باب الباء	۵۲-۶۵	درد، خواجہ میر درد	۹۸
بیدل، میرزا عبدالقادر	۵۳	دردمند، فقیر صاحب	۱۰۰
بیان، احسن اللہ خاں	۵۵	دل، شیخ محمد عابد	۱۰۲

مضامین	نمبر صفحہ
دیوانہ، رائے سرب سنگھ	۱۰۲
باب السین	۱۰۳-۱۲۰
سودا، میرزا محمد رفیع	۱۰۳
سوز، سید میر	۱۱۳
سجاد، میر سجاد	۱۱۹
باب الشین	۱۲۱
شورش، میر غلام حسین	۱۲۱
باب الصاد	۱۲۲-۱۲۳
صانع، نظام الدین	۱۲۲
باب الضاد	۱۲۳-۱۲۴
ضیا، میر ضیاء الدین	۱۲۳
باب العین	۱۲۴-۱۲۸
عزلت، سید عبدالولی	۱۲۴
عشق، شاہ رکن الدین	۱۲۶
عیش، میرزا عسکری	۱۲۸
باب الفاء	۱۲۸-۱۳۴
فقیر، میر شمس الدین	۱۲۸
فغاں، اشرف علی خاں	۱۳۰
فرحت، شیخ فرحت اللہ	۱۳۱
فدوی، میرزا محمد علی	۱۳۲
باب القاف	۱۳۴-۱۳۵
قایم، شیخ محمد قایم	۱۳۴
قدرت، شاہ قدرت اللہ	۱۳۸
باب الکاف	۱۳۵-۱۴۶
کلیم، شیخ محمد حسین	۱۴۵
باب اللام	۱۴۶-۱۵۰
لطف، میرزا علی، مصنف تذکرہ ہذا	۱۴۶-۱۵۰
باب المیم	۱۵۲-۱۷۳
میر، میر محمد تقی	۱۵۲
مظہر، میرزا جان جاناں	۱۵۸ / ۱۵۹
مضمون، شیخ شرف الدین	۱۶۰
مخلص، مخلص علی خاں	۱۶۲
مجذوب، میر غلام حیدر	۱۶۵
مصحفی، غلام ہمدانی	۱۶۵
محبت، نواب محبت خاں	۱۶۷
مست، میر قمر الدین	۱۷۱
باب النون	۱۷۳-۱۷۵
ناجی، محمد شاکر	۱۷۳
نعیم، نعیم اللہ	۱۷۵
باب الواو	۱۷۵-۱۸۰
ولی، شاہ ولی اللہ دکنی	۱۷۵
ولی، میرزا محمد ولی	۱۷۹
باب الہاء	۱۸۰-۱۸۴
ہدایت، شیخ ہدایت اللہ	۱۸۰
باب الیا	۱۸۴-۱۹۶
یقین، انعام اللہ خاں	۱۸۴
یکرنگ، مصطفی قلی خاں	۱۹۵

پبلشر کی التماس

سنہ ۱۳۲۶ ہجری کے موسم برسات میں پائے تخت حیدرآباد کی مشہور ندی میں، جو حصارِ شہر کے نیچے بہتی چلی گئی ہے، ایک عظیم الشان سیلاب آیا۔ اس سیلاب سے لاکھوں روپے کا نقصان ہوا، اور کچھ لوگوں کو بہ مصداق "چوں خراب شود خانۂ خدا گردد" فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن اس طوفان کی سب سے بڑی اور مفید یادگار یہ تذکرہ ہے، جو پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر سیلاب نہ آتا تو اس منجمد زمین سے اس علمی چشمے کا بہنا ممکن نہ تھا۔ یہ سیلاب جہاں اَور ہزاروں چیزوں کو اپنے ساتھ لایا، وہاں کسی آفت زدہ کا ایک کتب خانہ بھی بہا لایا؛ اور اُس میں یہ تذکرہ بھی تھا۔ پبلک میں یہ آب آوردہ کتابیں کوڑیوں کے داموں بکیں، اور یہ تذکرہ ہمارے کرم فرما، مولوی غلام محمد صاحب، مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھ لگا، انہوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ علامہ موصوف نے اس کو بدرجۂ غایت پسند کیا، اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا؛ لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرزِ عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی۔ اور علامہ موصوف نے ہم کو اُس کے شائع کرنے کی رائے دی اور خود اُس کے اِڈِٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی، اور اُس پر کچھ نوٹ بھی لگائے، جو بجنسہ چھاپ دیئے گئے ہیں +

اس تذکرے کی معنوی خوبیاں، اور تاریخی حیثیت سے اُس کی اہمیت، اُس مقدمے سے ظاہر ہوگی جو ہمارے کرم فرما مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے، پرنسپل مدرسہ آصفیہ حیدرآباد نے ہماری فرمایش سے اس تذکرے پر لکھا ہے جس میں اُنہوں نے اُردو زبان کی نشو و نما کی تاریخ اور اُس کی قدیم تصانیف کا بیان اور تذکرہ ہذا کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو ریویو لکھنے میں جو خاص ملکہ ہے، اُس کو تمام اُردو داں پبلک جانتی ہے، کہ وہ کس خوبی سے اس اہم کام کو انجام دیتے ہیں، اس لئے ہم بجز شکریئے کے اَور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے +

ہمیں مولوی غلام محمد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جنہوں نے اپنی علمی فیاضی سے، یہ کتاب ہم کو چھاپنے کے لئے دی اور کئی سال تک ہمارے پاس رہی۔ علامہ شبلی بھی خاص شکریئے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اپنی عنایت سے اُس کی تصحیح، اور تحشی میں اپنا وقت صرف کیا ٭

اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور حتّی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے، البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونۂ کلام، جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا، اُس میں سے صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے، اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوقِ سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اَور کوئی تصرف نہیں کیا گیا بلکہ مقدمے اور نوٹوں سے اُس کو اَور زیادہ مخزنِ معلومات بنایا گیا ہے۔ جس کی قدردانی کی پبلک سے اُمید کی جاتی ہے۔ اگر پبلک نے اس کی قدردانی کی تو ہم بہت جلد اَور مفید علمی کتابوں کے شائع کرنے کے قابل ہو سکیں گے جو انگریزی اور عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں ٭

عبداللہ خاں

کتب خانۂ آصفیہ
حیدرآباد دکن
۱۶ / نومبر ۱۹۰۶ء

مقدمہ

بر تذکرۂ گلشنِ ہند

(از مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے۔ پرنسپل مدرسہ آصفیہ۔ حیدر آباد دکن۔)

یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت[1] شخص کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا، اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمایش کو جو انھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا، اور بسر و چشم قبول کیا +

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد، اور امیر الممالک لارڈ وارن ہیس ٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں، علی[2] ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی

---

[1] مولوی عبداللہ خان صاحب کتبخانہ آصفیہ حیدر آباد دکن ۱۲ [2] علی ابراہیم خاں، متخلص بہ خلیل، مشہور ادیب و مورخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے، اور بعد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے، اور ۱۲۰۸ ہجری میں وہیں انتقال کیا ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں:

(۱) گلزار ابراہیم، تذکرہ شعرائے اردو، جو شاہ عالم کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہیس ٹنگز کی گورنر جنرلی میں ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں لکھا ہے، اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے اس تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی +

(۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم، یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں +

(۳) وقائع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس سنہ ۱۲۰۱ ہجری میں لکھی گئی۔ اس میں سنہ ۱۱۶۱ھ سے سنہ ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں۔ بیجز فنڈ نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں، اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی +

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے، اگرچہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خاں یکے از خیر خواہان کمپنی انگریز ام" لہذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے +

(۵) خطوط، جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اور جس سے اس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے +

میں لکھا تھا، اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ سنہ ہجری مطابق ۱۷۸۴ سنہ عیسوی میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے مؤلف تذکرۂ ہذا سے فرمایش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور اُن میں اردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے، بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے +

یہ تالیف اُس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بے کسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہل کمال اپنے وطن سے مُنہ موڑ اُسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے، قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو اُنہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین، منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خاں نے جو ہزار پھکڑوں کا ایک پھکڑ تھا، آخر انہیں اپنی گوں نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا ۔

"میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک، لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رُخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی، اور زوال اس لئے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اَور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا،

ایک آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی، کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہوگیا؛ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں، اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے، کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعراء کی محنت سے زبان صاف ہوگئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی، اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرائے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے، اردو کے استاد ہیں۔ مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اردو ہے، مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں، کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے)، سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب اردو کو وسعت ہو تو کیوں کر۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی، اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا، جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔ اس نے اردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے، اسی کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آتی۔ اس لئے انھوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلگرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں، بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قایم کیا، جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں، ان کی

تعلیم کے لئے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو دربارہ و دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی، اور دوسرے دور میں اردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے۔ اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا، اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلگرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے +

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا، لہذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا اس کی نگرانی میں، یا اَور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا، اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا، نامناسب نہ ہوگا +

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حید بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۱ء عیسوی میں توتا کہانی لکھی، جو اصل میں انہوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا، مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرایش محفل یعنی مشہور قصۂ حاتم بھی جواب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گل مغفرت یا وہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اُردو ترجمہ کیا ہے جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اَور کتاب تاریخ نادری اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے +

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انہوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے۔ اور ایک اَور کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب

ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں ◆

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ احمد شاہ درانی کے زمانے میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے۔ یہاں سے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب ۱۸۰۱-۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا، اور اس کا نام نوطرز مرصع رکھا تھا۔ میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانے میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے ۱۸۰۳ء میں انہوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا، اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے ◆

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیان مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہجہان آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے۔ اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ تلمذ ان کو میر حیدر علی حیران سے ہے، اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، بارلو صاحب نے، مسٹر گلکرسٹ کے مشورے سے، زبان دانانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا، چنانچہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپے خرچ راہ دیا، اور کلکتہ روانہ کیا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انہوں نے

ایک قابل قدر کتاب آرایش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے، اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی سنہ ۱۸۰۸ء میں سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چند نے سنہ ۱۸۰۴ء میں مثنوی گل بکاولی کو اُردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے، اور وہاں سے سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ انہوں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاکا میں (سنہ ۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے، اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا، جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے، کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لالو گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں، مثلاً پریم ساگر، راج نیتی، و لطایف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے۔ اور نیز ولا کی مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلگرسٹ نے سنہ ۱۸۱۰ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے، اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلگرسٹ سے اول بھی

ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی، جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی، جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، جس کے انہوں نے تین حصّے کئے، مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آگئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انہیں ناگری ٹائپ کا انتظار تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا، اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلگرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں، مگر چوں کہ ان کو اَور بہت سے کام کرنے تھے، اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہوگئے، اور ڈاکٹر گلگرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے ✦

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۰ء میں چھاپ دیا، مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دقّتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دقّت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے۔ صرف ستّر صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالاں کہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ وکمانڈنٹ ملٹری ایکاڈمی نے اُردو لغت لکھنی شروع کی، مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا، اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظر ثانی کر کے چھپوایا ✦

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی، جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شیکسپیر نے ایک اُردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی، یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لنڈن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی

برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ برائس کی لغت ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی۔ پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے، جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھیں، ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے، یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں +

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کی ترقی دینے میں انہوں نے حتی الامکان کوشش کی +

میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے:-

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زباں دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ "گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول "کے محول ہوئے، اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں "سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا درخواست حالی ہے"+

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا، کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا! چوں کہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان ان کی نظم کی طرح سے سر اور آنکھوں پر رکھتے، اور اردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا +

نواب محبت خاں محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کے ذکر میں لکھا ہے کہ:-

"انہوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمایش سے قصہ سسی پنوں کا اُردو میں نظم کیا، اور نام اس کا اسرار محبت رکھا۔"

میر قمر الدین کے حال میں درج ہے کہ:-

"انہوں نے میر محمد حسین۔ فرنگی لقب کے توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا، اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہشتین (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی اعانت سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔"

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کرنل ہال رائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اُردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی۔ سلسلہ تعلیم کے لئے عُمدہ عُمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا۔ کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا، اور اس میں کارآمد صلاحیں کیں۔ اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قایم کی جس میں نیچرل مضامین پر عُمدہ عمدہ نظمیں لکھوائیں شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی، اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کی طرح اُردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر رل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اُردو کی صدارت قبول فرما کر اُردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے، اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اُردو کتابیں بھی انہوں ہی نے چھپوائیں۔ اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اُردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں، اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلگرسٹ، اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لتھوگراف پریس سب سے پہلے دہلی میں ۱۸۳۷ء میں، استعمال ہوا۔

اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی ✦

وہ انگریز حاکم، جس نے اُس ملک میں بیٹھ کر جو اُردو کا جنم بھوم اور وطن مالوفہ ہے، اُسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا۔ اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا، اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب و غریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب و غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے، ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں، اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اُس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی ✦

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے، دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے، بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے، اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ اِدھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے ✦

نام میرزا علی تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے، ۱۱۵۴ھ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد تشریف لائے، اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا، فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں:

”میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا مگر چوں کہ مسٹر گلکرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس

"تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہٰذا میں نے اسے بسرو چشم قبول کیا۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں، عہد سلطنت قایم ہے، اُسی بادشاہ روشن دل خداپرست سے ....."

پھر اس کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے، اور بعد ازاں مارکوئیس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-

"موافق حکم اس صاحب والامناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچدان نے یہ تذکرہ لکھا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مؤلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا۔ اس کے مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ھ ہجری میں لکھی گئی۔

"حیراں پھریں ہیں بے سروپا بہمن اور وے
تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے"
۱۲ - ۱۲۲۷ = ۱۲۱۵ھ ہجری

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمایش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے کلام میں وہ قصاید درج ہیں جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطوجاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے، اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے، اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہے، یا اہل حیدرآباد سے، اس لئے انہوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی

---

۵۷ ڈاکٹر جان گلگرسٹ ۱۲

سے ادا کیا ہے، کہتے ہیں:-

"ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے"
"دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے"

جو قصیدہ اُنھوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے، اور دکن میں جاکر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہوگئے تھے، مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں:-

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا / سو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گزار
"شکرِ خدا، کہ آج بیک بینی و دو گوش / گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر در پہ خوار و زار
"ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکوں / لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار
"اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض / سو یہ ہے، اے امیرِ فلک قدر و کے تبار!
"سرکار سے تری جو زراہِ تفضلات / ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار
"ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں / جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل او نہار
"بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے / ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار
"خلقِ خدا کا بار اُٹھاتی ہے پالکی / میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیرِ بار
"باقی جو سو رہے، کئی دن میں زباں پہ پھر / مثلِ مجرّدات فقط ان کا ہے شمار
"تجھ سا ہو قدردانِ نکات، اور یہ نکتہ سنج / یوں ہو اسیرِ پنجۂ چرخِ ستم شعار
فضل و ہنر جو مجھ میں سب ہے وہ سب یکطرف / اور قدردانیاں بھی تری سب یہ یک کنار
"ہے ہمتِ بلند کا تیری جو اقتضا / اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار
"ازبس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے / بالفعل تو اضافے کا ہوں گا امیدوار
لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام / کہ ہوں سو پچاس میں گر ہو کشودِ کار

"تضنیف اصل چاہتا ہی تجھ سے ضعیف	کیوں کرے یہ بے حیائی نہیں ہوتی بارہا	
"غالب تجھ پہ شاق نہوں سے تیرتین سو	چھ سو جب اُمیّوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار	

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہے، اور اب تک باقی ہے۔

اس قصیدے میں شاعر نے تعلی کی لی ہے، اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر۔

"اے شان حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار"

امیر الامراء نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے:۔

"خبر نقط ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات — ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار"
"آئینِ قدردانی ہیں لیکن برائے نام — لازم یہی ہے کرگیا جو خانِ باوقار"

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے:۔

"کہتی ہے فارسی میں مجھ طبع مطلعے — ہاں درجواب مطلع ناصر علی بیار
"اے ذرہ ہا زنامِ تو خورشید اعتبار — تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار"

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی یہی رونا رویا ہے،

"پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہی تجھ سے — کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
"توجہ اتنی فرما تو کہ یا محتاج کی رو سے — نہ ہوں محتاج عندالوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے تذکرہ شعرا گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔"

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں:-

"اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع نا صواب سے ہے"۔

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہئیے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں، اور غالباً اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے، مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو اُردو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چوں کہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمایش سے لکھا ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قافئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اَور بھی لکھے گئے ہیں، مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

۱۔ اوّل تو سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے، اور محقق علم اللسان کو، اور نیز اُن لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے، کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرّہ بول چال میں آتے ہیں، اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں، اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر بھنا کرکے تھے"۔

اسی طرح میر قمرالدین منت کے حال میں لکھا ہے:-

"چنانچہ شکرستاں کرکے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے"۔

دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں، سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے۔

"ہے جیتے ہی تو مجھ کو ئے یار میں رونا رہے گا مرگ کے 'بعد از' مزار میں رونا"

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدر آباد میں اکثر سنتے ہیں۔ مثلاً:۔ فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے، مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ منیا کے حال میں لکھا ہے:۔

محمتی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھیرے "۔

فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے "۔

دکن میں عام طور پر "میں کہا" بولتے ہیں، قایم کہتے ہیں:۔

"میں کہا" عہد کیا کیا تھا رات،

"ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں "۔

۲۔ دوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اُردو زبان عروج پر تھی، اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مولف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی، اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً:۔ رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے، اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو انہوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ناقدردانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے معشہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد ہا کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طراز

"بیان میں معانی پرواز سے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے"

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:-

"جب میر صاحب لکھنؤ گئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا، مگر چوں کہ بد مزاج انتہا درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا، اور گھر بیٹھ رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ:-

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہیں، وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا"

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ لکھنا کہ وہ نان شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے، یا یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے، ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا، اور ان کا ۱۱۷۳ھ ہجری میں تخت نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ، بالتفصیل لکھا ہے۔ اور اخیر میں کور نمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے؛ اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے، جس میں یہ واقعہ منظوم ہے، اور خود اردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے، اس لئے کہ تذکرہ اردو کا ہے، اور اصل غزل حاشیے پر لکھ دی ہے۔ البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تاناشاہ، آصف الدولہ اور

مرزا محمد رضا اُمید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا اُمید کے تذکرے میں، امیر الامرا حسین علی خاں، اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔

۴۔ چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے، کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا، اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا اُنہیں اَور کھو دیا۔ مُلک گیری اور مُلک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر شاعری نے اس کا سامان اَور مہیا کر دیا، دیوانہ را ہوئے بس است، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، با کمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے، اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے، جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہو گی؟

علاوہ اس عام حالت کے، تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ، جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا، اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہان دہلی اور ان کے

گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے:۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے
"کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے
"پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجراگاہ پر سے جاکر آداب بجالاتے"

۵۔ پانچویں، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جس کی نسبت اردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اردو کے شاعر تھے، اور ان کا تخلص اشتیاق تھا۔ یا عبدالقادر بیدل بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، جو آدھا اردو اور آدھا ہندی ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک موقعہ پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سابقہ پڑا؛ چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے
"قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے
کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی، اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے
"یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں"۔

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصہ، جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہے۔ میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ ناظرین کو لکھنؤ کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا۔

"زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے — اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے"

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تھا۔ میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے؛ در حقیقت کلام سب اچھا ہے، مگر افسوس آج کل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی، میاں سید محمد میر اثر، کی مثنوی خواب و خیال اب تک سنی ہی سنی تھی، اس کے

چند شعرا اثر کے حالات میں درج ہیں شمس العلما مولوی شبلی نے اس پر مفصلہ ذیل نوٹ لکھا ہے، جو کتاب کے صفحہ ۳۴ پر درج ہے:

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے لیکن چوں کہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہوسکتی، اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کرسکتے ہیں، کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہوسکتی ہے"۔

ہمیں تعجب ہے، کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالاں کہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہوسکتا؛ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں؛ یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں انہیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالاں کہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشو و نما اور اُس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے، تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آگیا ہے، اور اس میں دلّی لکھنو والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کرلیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہلِ وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شایق ہیں تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے، وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہوسکتی ہیں؛ تو لوگوں کے عام، (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا؛ اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے، یکایک متزلزل ہوگئے، اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہوگیا ہے۔ مولانا نے اس کی

سلہ شمس العلما مولوی شبلی نے ازراہ نوازش اس تذکرہ پر جا بجا نوٹ تحریر فرمائے ہیں۔

خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اُس رتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اُسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں، مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کھُل جائے حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں، مولانا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انہوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے:۔

"مثنوی ایشاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است، وازیں جہت مرغوب عام"

مولوی محمد حسین آزاد آبِ حیات میں کہتے ہیں کہ:۔

"ایک مثنوی خواب وخیال ان کی مشہور ہے، اور بہت اچھی لکھی ہے"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں درد، زبان کی صفائی، شستگی اور لطافت بدرجۂ کمال موجود ہے، اور یہ سب باتیں مثنوی کے لئے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے، کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا سراپا کا مضمون اس قدر مُبتذل ہے کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا، یا اس میں زبان کی فصاحت وسلاست دکھانا بہت مشکل ہے۔ اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے، اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے، مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہے، لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے لیکن اس کا کیا جواب ہے، کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہے، یعنی:۔

اثر   ہاتھا پائی میں ہاسے نپٹتے جانا   کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

شوق   ناتھا پانی میں ہانپتے جاتا   چھوٹے کپڑوں کو دُعا پنپتے جاتا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا ان کے بعد نواب میرزا شوق، اگر یہ شعر ان کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے، کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہارِ عشق میں موجود ہیں۔"

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ وہ مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اُردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب وخیال کو بہارِ عشق سے کچھ نسبت نہیں ہوسکتی۔"

اخیر اس میں تو ظاہرا ایک حد تک کچھ گنجایش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزارِ نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزارِ نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے، کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوقِ سلیم سے کوسوں دور ہیں۔ اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے۔ ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آپڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

٦۔ چھٹے، صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں، جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے، مثلاً: شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسنین اور جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں۔"

حالاں کہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر کہ "یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے" خوب ہجو ملیح کی ہے، اور آخر میں یہ لکھا ہے:۔

"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع لاابالی مقدروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار، بقول شاعر کے:"

"شیر کے بچے میں غرّش شیر سے افزوں ہے بھونا ہیں کتے کی بھی پلّے ہی موجود ہے"

یا مظہر جانِ جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں:-

"۱۱۹۴ ہجری تھے کہ اس روشن سازِ مسائل صدیقی نے، اور اس معتقدِ پرداز احکام فاروقی نے، اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا"

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ:-

"خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلوم اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا تقاضا ہے"

مکہ مسجد کا کھدوانا زا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدرآباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں، کہ مکہ مسجد موجود ہے، اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگذر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں ان کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا بیستتی کی ہے، لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے:-

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رُتبہ نام کا نہ پایا"

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ:-

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے"

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے۔ دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اس میں جنم لیا، وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے۔ زمانہ قدیم سے محسودِ آفاق اور مرجع خلائق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دھانی، کبھی سلاطین

اسلام کا دار الخلافت کبھی طغیانی کی بدولت بہ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا، کبھی معرکہ جنگ وجدل وقتل عام ہے، اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے، کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال ہے، اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے، کبھی مورد بلیات و آفات ہے، اور کبھی منزل حسنات و برکات، غرض یہ نگری یوں ہیں اُجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی، مگر باوجود اس کے اس کے حُسن عالم فروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی لیکن اخیر زمانے میں، جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں، تو دو ایک جھٹکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔ سب سے اول نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا، کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا، اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ ادھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا، اب تک جو باکمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے۔ ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوائے ایک میر درد کے جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں:

> "جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے، اور کثرت منتخبان عدیم المثال تھے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث، اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت وعذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صابر زاویہ گزین نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وحید الاعتبار، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے، اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔"

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا، اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا: آصف الدولہ سا لکھ لُٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو اُٹھا وہیں پہنچا، اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خان آرزو پہنچے، اس کے بعد سودا تشریف لے گئے، سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے سنہ ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کوچ فرمایا

میر صاحب کے جاتے ہی دلّی سونی ہو گئی، اور میر حسن، میر سوز، جرأت، سب لکھنؤ میں جا بسے، اور دلّی کی رونق لکھنؤ میں آ گئی۔ اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہ امر کہ لکھنؤ کی سوسائٹی کا اردو زبان اور اردو شاعری پر کیا اثر ہوا، تو اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خان کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہو گی، اور کم سے کم اس قصے کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے، مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ ہجری میں لکھا گیا، اور ۱۲۱۵ھ تک میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے، یا اسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیوں کہ میرزا سلیمان شکوہ اسی سال (۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلّی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے"، مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے، اور آزاد نے کس سے سنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگین کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی، میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یوں بھی اس میں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مولف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے:-

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ ہے جس میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار، اور شعرائے صاحب وقار، کے حالات لکھے گئے ہیں، دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہو گا۔"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا ان کے کلام کو بجنسہٖ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دئے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہو گا، اور جو لوگ اردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

عبد الحق بی۔ اے (پرنسپل مدرسہ آصفیہ)
حیدرآباد دکن، اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رعنائی اور زیبائی، دلبرانِ سخن کو اُس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے، جس نے معشوقانِ زبانِ ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔ دلربائی اور رنگیں ادائی، نازفروشانِ ناطقہ کو اُس بے نیاز کی ثنا سے شامل ہے، جس نے محبوبانِ کلامِ اُردو کو زیورِ الفاظِ عربی اور فارسی کی آرایش کے ساتھ خرامِ ناز سکھایا ✦

ثنا اور حمد ہے اُس ذوالمنن کو — یہ بخشی جس نے رنگینی سخن کو
چمن ط کے ہم نے معنی کی جو لی باس — تو ہر گل کی نئی بُو ہے نئی باس

سرسبزی اور شادابی، چمنِ بیان نے اُس بہارِ گلشنِ [illegible] کی نعت سے پائی، جس کی آبیاریِ فیضِ عام کے باعث خارِ خارِ نظمِ دلخراش اُردو کا رشکِ رگِ گل ہے۔ تر و تازگی اور سبزی گلبنِ معانی کو اُس رونقِ گلزارِ رسالت کی توصیف نے عطا فرمائی، جس کی نسیمِ نعت کی موج زنی سے ہر فقرۂ پریشانِ نظمِ ریختہ کا حسرتِ سنبل ہے۔ **قطعہ**

رحمۃ للعالمیں جب ہے سنی ہے اُس کی ذات — گرمیِ خورشیدِ محشر سے نہیں کچھ بیم ہے
گو ہمارے جرم ہم کو آتشِ نمرود ہوں — وہ شفیع اپنا ہے، تو گلزارِ ابراہیم ہے

ط۱ اس مصرع میں تعقید ہے، اصل عبارت یوں ہے "معنی کے چمن کی جو ہم نے باس لی"، باس لینا یعنی خوشبو سونگھنا ✦

آبداری تیغ زباں کو اُس جوہر شمشیر شجاعت کی منقبت نے بخشی ہے، جس کی سیفِ دشمن گداز کے مضمون نے دو مصرعۂ آبدار کو بخشا رتبہ ذو الفقار[۱] کا۔ اور وسعت میدانِ سخن طرازی کو اُس شہسوار عرصۂ یکہ تازی کی تعریف نے عطا کی ہے، جس کی کشت گلگوں کی تحریر سے کیفیتِ خامہ کرتا ہے صفحۂ کاغذ کو تختۂ گلزار کا

ہے گلستانِ ولایت کا وہ باب	تذکرے کا علمِ دیں کے انتخاب
لفظ و معنی مصرعِ آئیں کا ہے	مطلعِ دلکش بیاضِ دیں کا ہے
مدِ بسم اللہ سرِ لوحِ نجات	شاہ بیتِ کلیاتِ کائنات
اور فرزند اُس کے عالی دودماں	تا جنابِ حضرتِ صاحب زماں
آلِ پیغمبر اور اصحابِ کرام	ہو نزولِ رحمت اُن پر اور سلام

بعد حمد اور صلوٰۃ کے، رنگ دینے والوں کو چمن بیان کے معلوم ہووے، کہ شاہ گیتی افروز روشن ضمیر، شاہ عالم بادشاہ غازی کی بادشاہت میں، اور شمعِ شبستانِ دولت و اقبال وزیرِ اعظم ہندوستان نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ کی وزارت میں، اور رونقِ بزمِ انصاف و عدالت نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن[۲] ہیسٹن جلادت جنگ بہادر کی ریاست اور امارت میں، علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اُس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سرحلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفلِ معانی، سخن کی جان اور سخن دانوں کی قدردان، صاحب والا مناقب، مسٹر گلگرسٹ[۳] صاحب کی نظر مبارک سے گذرا

[۱] یعنی ذو الفقار کا رتبہ بخشا ۱۲

[۲] اس عہد ہندوستان کے گورنر جنرل، دہلی کے دربار سے خطاب حاصل کرتے تھے، اور اُس کو فخریہ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے ۱۲

[۳] یہ وہی گلگرسٹ صاحب ہیں جن کے ایما سے میر امن صاحب نے چار درویش لکھی۔ درحقیقت اُردو زبان کا رفارمر یہی شخص ہے ۱۲

ازبس کہ شاعروں کا احوال اُس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبانِ ریختہ میں کیا جائے، تو خوب ہو، اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے، تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزا پائیں گے، اور نومشق کیفیت بہت اُٹھائینگے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی، میرزا علی کو، کہ **لطف** تخلص کرتا ہے، نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ "تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں"۔ اگرچہ یہ پابند اُلفت کا اس ایام میں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا رکھتا تھا، لیکن اس خُلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا، کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سر مو آپکے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ خلق بھی سحر حلال ہے، جن لوگوں کا یہ آئین ہے اُن کا خوشحال ہے۔ غرض مدعائے دلی اُس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا، کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد یہی ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم اُن کی تربیت کے لئے سارا یہ خونِ جگر کھاتے ہیں، تاکہ اُن کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے، اور اُن کی طبیعت اُس سے بخوبی مزا اُٹھاوے[1]۔ تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے، تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں "سبحان اللہ"۔ اور لفظ فارسی جگہ پاوے، تو ویسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں "واہ واہ"۔ اُمید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سرانجام اور مقبولِ نگاہِ خاص و عام ہو۔

الحمد للہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی

---

[1] اس فقرہ سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہلِ قلم، سادہ اُردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے۔ مصنف صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر سے اس نے یہ ذلت گوارا کی ۱۲

کے ہیں، عہدِ سلطنت قایم ہے ایسے بادشاہ روشن دل خدا پرست سے، جس کی چشم حقیقت بیں کے سامنے دلقِ گدائی اور خلعتِ شاہی برابر ہے، اور نظرِ معرفت اثر کے روبرو مساوی کلاہِ فقیر اور تاجِ اسکندر ہے۔ تخت نشین بارگاہِ سرفرازی، **شاہ عالم بادشاہ غازی**، قایم رکھے اللہ تعالیٰ اس شاہِ بے آزار کو، اور زیادہ کرے اُس کی قدرت اور اقتدار کو۔ اور بالفعل مسندِ وزارت کو زیب اور زینت اُس رونق بخشِ بزمِ عیش و کامرانی سے ہے جس کی محفل عیش و نشاط کی غیرت سے تعجب نہیں ہے کہ زہرہ غرقِ عرقِ پشیمانی میں ہو، اور مشتری مانندِ آئینہ کے گرفتارِ بندِ حیرانی میں۔ ساغر نوشِ خمخانۂ دولت و اقبال، مخمورِ بادۂ جاہ و جلال، یمین الدولہ ناظم الملک **سعادت علی خاں** بہادر مبارز جنگ، ساقیِ روزگار جامِ اُمید کو اُس کے شرابِ مراد سے چھلکتا رکھے اور اس ایامِ فرخندہ فرجام میں محفلِ حکومت اور ایالت اُس امیر صاحبِ تدبیر سے رونق پذیر ہے، جس کی بہارِ گلشنِ عدالت میں تحقیقات ہے چاکِ گریبانِ گل کی[۱] اور پرسش ہے نالۂ دلخراشِ بلبل کی، کہ گل کا گریبان کیوں چاک ہے؟ اور بلبل کی آواز کیوں دردناک ہے؟ سوسن کی زبان بندی سو سو بار ہوتی ہے، اور نرگس کے احوال کی تلاش ہے کہ راتوں کو کیوں نہیں سوتی ہے؟ اس زبان داری پر کیا باعث ہے سوسن کی بے زبانی کا؟ اس چشم خماری پر کیا موجب ہے نرگس کی حیرانی کا؟ قمری کے طوقِ گردن کی جست و جو ہے، اور صدا اُس کی "جو کو کو" ہے، اُس میں گفتگو ہے، کہ کسی چیز کا اس کی گم ہونا ثابت ہوتا ہے لفظ "کوکو" کی تکرار سے، گلا اس کا باندھا گیا کس تقصیر کے اقرار سے؟ غنچہ کی گٹھری کو نسیم بے اجازت بہار کے کھولے، تو صاحبِ تقصیر ہے، اور زرِ نقد کو گل کے خزاں غنی سے بھی ٹٹولے، تو واجب التعذیر ہے۔

سبحان اللہ عدل اور انصاف ویسا کہ جس کا مشکل بیان ہے۔ عقل اور فراست ایسی کہ جس

---

[۱] یعنی گریبانِ گل کی چاک کی تحقیقات ہے ۱۲

میں قاصر زبان ہے ارسطو کو سامنے تقریر کے دعوی طفل دبستانی کا، اور افلاطون کو روبرو تحریر کے اظہار ہیچمدانی کا۔ یہاں تک تو اُس کی قدردانی سے اب علم کا رواج ہے، کہ مملکت جہل جاہلوں کے ہاتھوں سے ہوتی جاتی تاراج ہے معمار حکم نے اُس کے وہ مدرسۂ عالی شان بناکیا ہے، جس کے بامِ عرش مقام کی پہلی سیڑھی اگر ساتویں آسمان کو کہئے تو بجا ہے۔ کرسی شاہ نشین کی گھمنڈ عرش نشانی کا رکھتی ہے۔ نسبت اس کو بیت الشرفِ آفتاب سے کیونکر دی جا سکتی ہے۔ صفائی کو دیوار کی دیکھ کر فقط آئینہ ہی حیرت سے نہیں پشت بر دیوار ہے، بلکہ شرمندگی سے پانی پانی گوہر آبدار ہے۔ تعریف سے اُس امیر عالی منزلت کی عہدہ برآ ہونا محال نہیں ہے زبان کی، اور توصیف سے اُس والا مرتبت کی نکتہ سرا ہونا طاقت نہیں ہے بیان کی۔ شہسوارِ معرکۂ دشمن ستیزی، سرحلقۂ گروہ خرد پژوہ انگریزی، زبدۂ نوابانِ عظیم الشان، مشیرِ خاصِ حضور فیض معور بادشاہ کیوان بارگاہِ انگلستان، اشرف الاشراف مارکویس ولزلی، گورنر جنرل بہادر ناظمِ ممالکِ محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر، و میر اعظمِ عساکر بادشاہی و سرکار کمپنی متعلقہ کشور ہند، فدویِ شاہ عالم بادشاہ غازی۔ عہد دولت میں اس عالی جناب کے ازبسکہ آرام اور چین ہر ایک شخص کے نصیب ہے، اور عز و وقار اہل علم کے قریب ہے، موافق حکم اس صاحبِ والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس کا، بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے، **گلشن ہند** رکھا۔

اگرچہ احتیاج تاریخ کے نظم کرنے کی نہ تھی، کس واسطے کہ نثر میں سنہ ہجری اور عیسوی دونوں کی کیفیت لکھی ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاید یہی سمجھ کر گلزار ابراہیم میں تاریخ نظم سے چشم پوشی کی ہے، لیکن یہ نہ چاہئے، کیونکہ بہ نسبت نثر کے نظم پر ہر ایک شخص کان دھرتا ہے، اور حافظہ اس کو بہت جلد قبول کرتا ہے، تعجب کیا ہے کہ اس کا اشتہار ہو، اور اہل سخن کی زبان پر اس کی تکرار ہو، تو جس کو سنی سنائی بھی یہ تاریخ یاد ہو گی، اس کو بن دیکھے اس تذکرہ کے معلوم اس کی بنیاد ہو گی۔ بارہا صفات کے اشتہار سے ذات کو شہرت ہوئی ہے۔ اس فائدہ کے واسطے تاریخ

نظم اس کی اس طور پر لکھی گئی ہے ۔ **قطعہ**

ہر ایک گل ہمیشہ بہار، اس حدیقہ کا	کہتا ہے یوں خزاں سے کہ "تو کیا بہشت ہے"
حیراں پھریں ہیں بے سروپا چمن اور دے	تاریخ اس کی جب سے کہ "رشک بہشت" ہے ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء

گلگشت کرنے والوں سے چمنستان نازک خیالی کے پوشیدہ نہ رہے، کہ اس نخلبند حدیقۂ بے استعدادی نے حسب الارشاد صاحب عالی شان مرقوم الصدر کے گلشن ہند کی دو جلدیں کی ہیں جلد اوّل یہ جو تحریر کی جاتی ہے، اس میں عرش پروازیاں سلاطین نامدار کی، اور گوہر باریاں وزرائے والا اتبار کی، اور خوش استعدادیاں اُمراے عالی مقدار کی، اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی، جو کہ نام آور اور صاحب دیوان تھے، بیان کی گئی ہیں۔ اور جلد دوم میں مذکور کئے گئے ہیں شعراے گم نام وغیرہ مشہور، یا وہ نومشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔ توفیق اس کتاب کی تمامی میں اُس مرجع کل سے چاہتا ہوں، کہ جس کی طرف رجوع ہے جزو کل کی۔ جل جلالہ و عم نوالہ۔

باب الف

ا۔ آفتاب

آفتاب تخلص، نور نیّر جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شاہزادگی میں گوہر صدف سلطنت کا نام عالی گوہر تھا۔ اُسی ایام میں عماد الملک کے خوف سے دلّی سے نکلے اور بعد بہت آوارگی کے نجیب خاں کے یہاں، کہ سردار قوم افغان کا تھا اور نجیب الدولہ خطاب رکھتا تھا، منتظر عنایت الٰہی کے ہو کر ٹھیرے۔ اس میں بعد ایک مدت کے محمد قلی خاں، بھتیجے نواب صفدر جنگ کو، کہ ناظم صوبۂ الہ آباد کا تھا، حوصلہ بنگالہ کی تسخیر کا دامن گیر ہوا مشورے سے نواب شجاع الدولہ کے، کہ وہ باطن میں محمد قلی خاں کے برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خان مذکور نے شاہزادے کو نجیب خاں کے ہاتھ سے بلوا کے، اور روسیلہ عزم کا ٹھیرا کے، آپ مع

فوج کے رکاب سعادت میں داخل ہوئے، اورالہ آباد سے کوچ کرکے قریب عظیم آباد کے آپڑے اب آگے رام نرائن، عظیم آباد کے نائب نظامت، کا بے حواس ہوکر محمد قلی خاں کی معرفت حضور میں شاہزادے کے حاضر ہونا مشہور ہے، اور پھر بگڑ کے چند مدت قلعہ میں عظیم آباد کے بند ہوکر لڑنا، یہ بھی تواریخ بینوں کی نگاہ سے نہیں مستور ہے۔

ابھی محمد قلی خاں قلعے کو لگے ہی ہوئے تھے، کہ اس میں بعد ایک چند روز کے شہرۂ جعفر علی خاں اور میرن کی آمد آمد کا، واسطے رام نرائن کی کمک کے مع کرنیل کلف بہادر ثابت جنگ کے مشرق کی طرف سے، ہوا۔ محمد قلی خاں نے اُن کی لڑائی سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت اپنے بیچ میں نہ پاکے، پیش ازاں کے داخل ہونے کے، کوچ بنارس کی طرف کیا، اور شاہزادہ عالی تبار عالی گوہر نے، کرم نام سی کی ندی[51] سے، کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے، عبور کرکے تھوڑی دُور گئے تھے، کہ باپ کے مارے جانے کا احوال اس طور سے سُنا، کہ مہدی قلی خاں کشمیری، علی قلی خاں کے بھائی نے، کہ رفیق عماد الملک کا تھا، حسب الارشاد اپنے آقا کے حضور اعلیٰ میں عرض کی کہ "ایک فقیر بہت بڑا صاحب کمال فیروز شاہ کے کوٹلہ میں آکے اُترا ہے، حضرت کو ملاقات اس سے کرنی ضرور ہے" حضرت بیچارے اجل گرفتہ، حکم میں تو عماد الملک کے تھے ہی، اپنے پاؤں سے آپ قبر میں تشریف لے گئے۔ وہاں فقیر کہاں تھا، کئی ایک خونخوار جفا کار، بے شرم اور بے رحم اُس حُجرے میں بٹھا رکھے تھے، جاتے ہی اس بے گناہ کو پیش قبضوں سے مار کر لاش کو اوپر سے ریتی کی طرف کردیا۔ شاہزادے نے سُنتے ہی اس خبر کے، کھٹولے میں پہنچ کر، موافق ضابطۂ خاندانِ بابریہ کے ۱۱۷۳ھ گیارہ سو تہتر ہجری میں القاب مع "شاہ عالم" کے ساتھ تختِ سلطنت پر جلوس فرمایا۔ اور قلمدانِ وزارت کا مع خلعت جلد نواب شجاع الدولہ کے واسطے بھجوایا۔ ساتھ ہی اس کے خلعت امیر الامرائی کا، کہ عبارت میر بخشی گری سے ہے،

---

۵۱ یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم تھا ۱۲

نجیب الدولہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور نواب منیر الدولہ نے اُسی وقت موافق ارشاد کے ایلچی گری کے طور پر ابدالی کی طرف کوچ کیا۔ اتنے میں کامگار خاں پانچ چھ ہزار سوار سے، اور دلیر خاں اصالت خاں اپنی تمام جمعیت سے حاضر ہو کر، اقرار جانفشانی کے ساتھ داخل دائرۂ دولت کے ہوئے۔ چنانچہ کامگار خاں نے اخراجات ضروری کا اپنا ذمہ کیا، اور زمینداروں سے اتنے ہی عرصے میں، جس جس ڈھب سے بنا، کچھ کچھ رُپیا بھی لیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ میرن کے آنے سے آگے ہی رام نرائن سے لڑ لیجئے، اور خدا فضل کرے، تو قلعے عظیم آباد کے عمل کیجئے۔ بادشاہ کو بھی یہ مشورہ پسند آیا، اور اُسی وقت پیش خیمے کے کوچ کو حکم فرمایا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں متصل رام نرائن کے لشکر کے، کہ دیو ہانڈی کے کنارے پر پڑا تھا، آپڑے۔ اور بعد کئی دن کے میدان جنگ آراستہ کر کے کمال جانفشانی اور سر فروشی کے ساتھ لڑے۔

سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے گھوڑے چلائے، اور نہایت بہادری سے رام نرائن کی فوج میں در آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ غول ان کا نشانہ تھا چھرّوں کی مار کا، اور ہدف تھا بندوقوں کی باڑھ کا۔ بجلی کی طرح کڑک کر ہر ایک اژدہا توپ کا سا گرم آتش فشانی تھا، اور گولیوں کی بارش کے ساون بھادوں کا مینہ شرمندگی سے پانی پانی تھا۔ اس میں بندوقوں کی مار سے نشان[1] کے ہاتھی کا منہ پھر گیا۔ کسی نے دلیر خاں سے پکار کر کہا کہ "نشان کا ہاتھی پھر کھڑا ہوا"۔ فرمایا "کیا ہوا، ہاتھی پھرا، اور گو کہ آسمان بھی پھرے دلیر خاں تو نہیں پھرا"۔ یہ کہ کے دونوں بھائیوں نے کود کے گھوڑوں سے ایک تین سو جوانوں سے، کہ وہ رفیق ان کے تھے، ایسی ہی جانبازی کی کہ ساری زمین ان کی لاشوں سے بھر دی، اور تمام فوج رام نرائن کی تلے اوپر کر دی، خاطر خواہ دلاوری اور بہادری سے دل بھر کے، شجاعت اور تہوّر کا حق ادا کر کے، دونوں بھائیوں نے مع رفیقوں کے جان شیریں نثار کی، لیکن رام نرائن کی فوج میں بھی باقی نہ رہی جلادت گفتار کی۔

---

[1] یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا ۱۲

اس میں توپ اور بندوق تو بند ہو ہی گئی تھی، کامگار خاں مع اپنی فوج کے جو ایک طرف سے بیٹھا، تو برابر رام نرائن کے جا نکلا۔ لوگ رام نرائن کے، از بسکہ دلیر خاں کی لڑائی کھائے ہوئے تھے، دوبارہ کامگار خاں کے مقابلے کی طاقت نہ لا کے پسپا ہوئے۔

رام نرائن نے مقدمہ بے ڈول دیکھا، عین لڑائی میں کپتان کاکری صاحب سے کہلا بھیجا کہ "آدھے لوگ اپنے میری کمک کو بھیجئے" کپتان مذکور نے موافق حکم نائب نظامت کے اپنی فوج کے دو حصے کئے، اور آدھے آدمی ادھر بھیج دیئے۔ لیکن لوگ ان کے بھی تو لڑائی کی محنت اُٹھا چکے تھے، اور جس قدر چاہیئے تھا جی لڑا چکے تھے، کچھ کام بن نہ آیا، اور کسی طرح سے بندوبست نے لڑائی کے انتظام نہ پایا۔ چنانچہ کامگار خاں نے گھوڑا رام نرائن کے ہاتھی سے ملا دیا، اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ اپنی دانست میں اُنھوں نے مار لیا، لیکن اس مدبّر نے زخمی ہو کر ہودے میں لیٹ جانے کو غنیمت جانا اور تختوں کی آڑ کو وسیلہ زندگانی کا گردانا۔ غرض لڑائی بگڑ گئی، بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ کے مارے گئے، اور کچھ تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بچا رے گئے۔ مُرلی دھر مع رحم خاں اور غلام شاہ کے، کہ ہراول فوج کے تھے۔ کامگار خاں کے ہاتھ میں گر کر قتل ہوئے۔ احمد خاں قریشی اور مراد خاں، بیٹا بہرام خاں بلوچ کا، بھاگ کے رام نرائن کے شریک، عظیم آباد کی طرف قدم گزار ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے فتح اور نصرت کے ساتھ کھیت پر ڈیرا کرنے کا حکم دیا، اور بھاگے ہوؤں کا پیچھا مطلق نہ کیا۔ اب آگے بیان ساتھ تفصیل کے موجب طول کلام کا ہے +

مختصر یہ کہ آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اور جلوس مبارک کو سنہ بیالیسواں ۴۲ ہے، وہ اورنگ نشین بارگاہ جاہ و جلال تخت سلطنت پر ساتھ عیش و نشاط کے حکمراں ہے +

سنہ تیسویں میں عہد سلطنت کے، منظور علی خاں ناظر کی بے بصیری سے شیخ غلام قادر خاں

زہیلے نے جو کور نمکی کی ہے مفصل بیان اس کا غضب ہے، اور نہایت ترک ادب ہے، لیکن حضرت نے خود اپنی زبان بلاغت بیان سے اس روداد کو اس تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے، کہ اور کسی بندۂ آستان دولت کی کیا مجال تھی کہ اس واردات کو اس بے ادبی سے زبان تک لاتا۔ از بسکہ وہ غزل فارسی ہے، داخل کرنا اس کا بیچ کتاب کے خلاف آئین نثر ہندی کے معلوم ہوا، اس واسطے تیمناً و تبرکاً اس غزل کو حاشئے پر کتاب کے لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا لفظاً باللفظ کر کے اس طرح داخل کتاب کیا ہے **نظم**

حادثے کی اٹھی آندھی جو مری خواری کو — دم میں برباد کیا میری جہانداری کو

لہ

صرصر حادثہ برخاست پئے خواریِ ما — داد برباد سر و برگ جہانداریِ ما ۔
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم — بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد — تا نہ بینیم کہ کند غیر جہانداریِ ما
داد افغاں بچۂ شوکتِ شاہی بر باد — کیست جز ذاتِ مبرّا کہ کند یاریِ ما +
بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہمچوں مرض — دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش دیدیم — ہست مصروف کہ بخشند گنہگاریِ ما
کردہ سی۳۰ سال نظارت کہ مراد اد بباد — زود تر یافتہ پاداشِ ستمگاریِ ما
عہد و پیماں بہ میاں داد و نمودند دغا — مخلصاں خوب نمودند وفاداریِ ما
شیر دادم اعمی بچۂ را پروردم — عاقبت گشت مجوز بہ گرفتاریِ ما
حق طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم — کردہ تاراج و نمودند سبک باریِ ما
قوم مغلیہ و افغاں ہمہ بازی دادند — بسکہ گشتند مجوز بہ گرفتاریِ ما
ایں گدا زادۂ ہمداں کہ بہ دوزخ برود — بانیٔ جور و ستم شد بہ دل افگاریِ ما
گل محمد کہ زمرداں بہ شرارت کم نیست — چہ قدر کرد وکالت پئے آزاریِ ما
نامراد و سلیمان و بدل بیگِ لعیں — ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاریِ ما

بس کہ خورشید کو لازم ہے طلوع اور غروب
شام یوں پھولی غرض میری سیہ کاری کو

آنکھیں نکلیں، تو ہوا خوب کہ دیکھو نگا نہ میں
غیر کے قبضے میں اورنگ جہانداری کو

مملکت کا بھی خیال ایک مرض تھا جانکاہ
گردشِ چرخ نے کھویا مری بیماری کو

کی اس افغان بچے نے شوکتِ شاہی برباد
کون پہنچے گا خدا چھٹ[1] مری اب یاری کو

جو کئے تھے گنہ اُن سب کی سزا دیکھی ہیں
شاید اب پوچھیں نہ وہاں میری گنہگاری کو

جو تھا تیس برس سے مرے گھر کا ناظر
پہلے حکم اُس نے دیا میری دل آزاری کو

بے گناہی نے مری اس ستم ایجاد کئے ہیں
جلد پہنچا یا مکافات ستمگاری کو

حق طفلاں جو ہوا تیس برس میں تھا جمع
مار کر لے گئے یاں چھوڑ سنگ باری[2] کو

قومِ افغان و مغل سب نے مجھے بازی دی
رکھا ہر اک نے روا میری گرفتاری کو

عہد و پیمان کئے اس ہیں، بھلا حقِ نمک
ان سے سیکھے کوئی آئینِ وفاداری کو

تھا جس افغان بچے کو دودھ پلا کر پالا
بدلے اس حق کے وہ آیا میری خونخواری کو

نازنیں میری ہمدم جو تھیں یاں ایک نہیں
جز مبارک محل اس میری پرستاری کو

آصف الدولہ اور انگریز ہیں میرے دل سوز
کیا عجب آویں اگر میری مددگاری کو

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند کے ہاتھ
ہوگی بے رونقی اس طرز جفاکاری کو

شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من
زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من ست
ہست مصروفِ تلافی ستمگاری ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند
چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

راجہ و راو زمیندار امیر و چہ فقیہ
حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواری ما

نازنینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودند
نیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم
باز فردا دہد ایزد سر سرداری ما

[1] یعنی سوائے خدا کے ۱۲　[2] یعنی یہاں صرف سنگساری اور ہندوستی چھوڑ گئے ۱۲

کوئی پہنچا دو خبر حال کی میرے، اے نظام
شاید آنکلے محبت سے خبرداری کو

شاہِ تیمور سے ہے اک سرِ نسبت مجھ کو
دور کیا ہے جو کرے دورِ دل آزاری کو

راجہ و راؤ زمیندار امیر اور فقیر
چاہیے سمجھے سعادت میری غمخواری کو

آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سر و پا
بخشنے کا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو

حضرت جہاں پناہ کے مزاج مبارک کو نہایت نظم کی طرف التفات ہے، اور بیشتر شغل اشعار میں کٹتی اوقات ہے۔ ان شعروں کو اُس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں +

کیجیے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا۔
ہم تو بندے اُس کے ہوں، وہ یار ہوا اغیار کا

خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اُس نے آہ
ہو جیو یارب بھلا اس چشمِ آتشبار کا

صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے پکار
کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا

خون ہووے گا گالوں کا دیکھنا ہرگز صبا
نام مت لینا چمن میں اُس بت خونخوار کا

زلف تیری دیکھ کے زاہد رگِ جاں سے بنا
جاننا ہے گا سعادت باندھنا زنار کا۔

کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے
یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا

دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب
کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا

صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ
ڈھونڈھ جاکر ہر طرف نقشِ قدم دلدار کا

اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا۔

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

ولہ

شب دل آرام سے گذرتی ہے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

۲- آصف

آصف تخلص، نورِ کوکبِ ہمت اور شجاعت کا، خورشیدِ آسمانِ مروت اور سخاوت

کا، نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ، خلف نواب شجاع الدولہ مغفور کا ہے، اور پوتا نواب ابو منصور خاں صفدر جنگ کا۔ بعد وفات شجاع الدولہ کے کہ گیارہ سو ستاسی ۱۱۸۷ھ ہجری تھے، اور شاہ جہاں پناہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت کو پندرھواں سنہ تھا، بلدۂ فیض آباد میں، کہ قدیم نام اس کا بنگلا ہے، مسند وزارت کو زینت اس عالی تبار نے بخشی ہے۔ از بسکہ رسمِ کہن ہے کہ بادشاہ اور وزیر واسطے نام کے، عہد حکومت اپنے میں، نئے شہر کے آباد کرنے کی تلاش کرتے ہیں، اور وہاں مقر بود و باش کرتے ہیں۔ بعد چندے ہی اس آب و رنگ گلشنِ وزارت نے بنگلے سے کوچ کر کے خارستان لکھنؤ کو بہار قدوم سے اپنے رشک شگوفہ زار کشمیر کا کیا۔ لکھنؤ کے تنِ بے جان میں گویا جان آئی، اور چشم بے نور نے بصارت پائی۔ پھر تو آبادی پر شہر کے عرصہ زمین کا تنگ تھا، اور معموری کو اس خراب آباد کی تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ تھا۔ بسکہ اس بلند نظر کا اہل کمال کی طرف میلانِ خاطر تھا، ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی وہاں حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خواہش شکار کی مزاج سے بشدت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارتِ تازہ کی بنا کا دھرنا، اور ہر سال عین واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبے سفر کرنا۔ بے مبالغہ ہے کہ ہزاروں شیر مانند بکریوں کے مارنے میں آئے، یہاں تک کہ اُن کی کھالوں کے متعدد خیمے عالی شان بنوائے۔ پہلی ہی گولی اس کے ہاتھ کی گینڈے اور ارنے کو تھا پیغام اجل کا، اور بڑے دانت ہونے ہاتھی کے بس یہی اُس کے واسطے تھا دام اجل کا، منک پر فیلِ مست کی جب اس کا تیر بیٹھا، سوفار کا باہر نام نہ تھا۔ پہاڑ کو تنکے سے ٹالنا اس کے آگے کچھ کام نہ تھا۔ جنگلی ہاتھی دنتیلے اتنے مارے کہ آج دولت خانہ میں ایک عمارت عالی شان ہاتھی دانت کی موجود ہے جس کے ستون اور کڑیوں میں نام کو کہیں لکڑی کا نہیں وجود ہے۔ شجاعت کے سوائے سخاوت پر جب طبیعت آئی تو ہمت حاتم کی دل سے خلائق کے بھلائی۔ ایک دن میں

لاکھ روپیہ سے شریف مکہ کی خدمتگذاری کی، اور پانچ لاکھ روپے خرچ کرکے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کی۔ فیاض ایسا کہ جو کوئی سامنے کچھ لے گیا خالی نہیں پھرا ہے۔ بے مبالغہ ہے کہ خاک کی مٹھی کو اکثر اکسیر کی قیمت میں لیا ہے۔ اس میں کوئی گستاخ اگر اس کی قباحت زبان پر لایا، تو وہیں بے مزہ ہو کر اس سے فرمایا کہ "اتنی مروت کرنی اس شخص سے ہم نے مدت سے اپنے دل میں ٹھیرائی، یہ چٹکی خاک کی جو اس سے لی یہ مفت میں پائی" غرض جو کچھ چاہیے سب کمالوں کی جامعیت تھی۔ افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا تھا آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لایق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا چھبیس ۲۶ برس کُل اس مربع نشین مسندِ وزارت نے حکمرانی کی، اور چمن گیتی میں مانندِ گلِ خورشید کے محتاجوں پر زر فشانی کی آخرالامر ازبسکہ بیچ گلشن دنیا کے بہار اور خزاں آپس میں دست و گریبان ہیں، بیماری سے استسقی کی ۱۲۱۲ھ بارہ سو بارہ ہجری میں، کہ سلطنت کو شاہ عالم بادشاہ غازی کے چالیسواں سنہ تھا، اٹھائیسویں تاریخ ربیع الاول کی، پہر ڈیڑھ ایک دن رہے، حکومت عارضی کو ملک فنا کی چھوڑ کر کار فرمائی اقلیم بقا کی اختیار کی۔ راقم آثم صغر سن سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے مع رسالہ سرفراز تھا، اور افراطِ عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مورد امتیاز تھا اس شمع شبستان وزارت کی تاریخ وفات کا شعلہ اس جگر کباب کے گلخن طبع سے یوں آتش فشاں ہوا ہے۔ **قطعہ**

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا	اک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جامِ عمر اس کا بھرتے ہی لبریز	خلق کا[۱] عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتشِ غم سے	دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سالِ تاریخ کا خیال کسے	خشک شعر و سخن کا باغ ہوا

[۱] یعنی خلق کے عیش کا ایاغ لبریز ہوا ۱۲

بولے یوں دور کر کے پائے عناد
آج گل ہند کا چراغ ہوا ۱۲ ۱۲

یہ اشعار اُس عالی جناب کے مشہور ہیں +

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے	ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچہ میں نقش پا کی طرح	ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم	سینہ اک دن کہ جسم و جاں سے گئے
عشق! ہاتوں سے تیرے کیا کہئے	نام سے گذرے اور نشاں سے گئے
ایک دن ہم نے یار سے جو کہا	اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ "سنتا ہے آصف
یوں ہی کہہ کہ کے لاکھوں یاں سے گئے"

دل ہمارا خانۂ اللہ گر مشہور تھا	ولہ	سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بتخانہ ہوا
آباد ملکِ دل وہ یارو کہاں رہے گا	ولہ	جس جا یہ درد و غم کا نت کارواں ہیگا
آصف نہ چھُٹے عشقِ بتاں سے دل ہمارے	ولہ	سو بار اگر پھر بھی بناویں اسے گھڑ کر
شوخیِ چشم کی شہرت کو تری سُن سُن کر	ولہ	شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں
مرے دل کو زلفوں میں زنجیر کیجو	ولہ	یہ دیوانہ اپنا ہے تدبیر کیجو
مرے دل نے زلفوں میں مسکن کیا ہے		یہ مہماں ہے اے شانہ، توقیر کیجو
جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے	ولہ	آب سے آتش ہوئی کیوں کر ہم کیا جانئے
پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو	ولہ	میں ہوں، اور رات ہے، اور بسترِ تنہائی ہے
آصف نہ چھوڑ دست سخاوت کو زینہار	ولہ	لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا تو لئے
یاں تلک داغِ محبّت دل نے کھائے ہیں کہ بس	ولہ	سر سے پا تک ایک گویا صورت طاؤس ہے
ہزاروں مرے جیتے دیکھے ترے بات کرنے سے	ولہ	لبِ معجز بیاں میں ترے شاید آبِ حیواں ہے

۳- انجام

انجام تخلص، عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خاں نام۔ والد ماجد ان کے عمدۃ الملک نواب امیر خاں ہیں، کہ جو عالمگیر خلد مکان کے عہد سلطنت میں زینت بخش مسند امارت کے تھے۔ سلسلہ نسب شریف کا اس عالی خاندان کے میر میراں نعمت الٰہی کو، کہ سلاطین صفویہ کے ساتھ نسبت اور ناتا رکھتے تھے، پہنچتا ہے۔ بزرگ ان کے ہمیشہ ایران میں صدر نشین تھے محفل عز و وقار کے، اور ہندوستان میں بھی ہمیشہ انیس و جلیس رہے ہیں سلاطین نامدار کے۔ اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت بر آرہوئی تھی، کہ رشک تھا اس کا سب ارکان دولت کو، اور اعیان مملکت کو، حسد تھا۔ لطیفہ گوئی کی طرف طبیعت ان کی نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف۔ گردش چشم کے سمجھنے میں زمانے کے اُستاد تھے، اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد۔ موجد ناز و انداز کی تہ داریوں کے، اور اختراع کرنے والے جنون کی جادو کاریوں کے۔ گانے میں دخل ایسا تھا، کہ اُستاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور نا وبید کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے۔ بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا، کہ ایک دم کی جدائی اِن کی جہاں پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی لیکن موافقت و راندازی سے بدگویوں کی آخر آخر مبدل بہ غبار خاطر ہوئی، اور خواہان جان نہ بباطن بلکہ بظاہر ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۱۶۹ گیارہ سو اُنہتر ہجری میں ایک نمک حرام نے اُن ہی نوکروں میں سے انہیں کے عین صحن دولت خانہ میں بادشاہ کے قہر کیا، کہ اس روشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھوکے میں کٹاری کے بجھا دیا، اگرچہ اس نا اہل کا بھی اُسی جگہ لگ گیا ٹھکانا لیکن افسوس ہے نواب امیر خاں کا مارے جانا۔ اکثر ارباب فہم کو گمان تھا کہ یہ اشارہ بادشاہ کا تھا اور امر جہاں پناہ کا ہے۔ جب اس نمک حرام کی لاش کو اُٹھوانے میں بادشاہ نے نہایت کرم

فرمایا، پھر تو عوام کو بھی اس گمان کا بے تامل یقین آیا۔

اس عالی طبیعت کو پہیلی اور مکرنی کے کہنے میں مشق حد سے زیادہ تھی، اور اشعار فارسی اور ہندی میں بھی چنگی استعداد تھی۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے آویزہ گوش صغار و کبار ہیں۔

کیوں بلایا مجھے ہیں کیا مجھ سے نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز
ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کی محبت دشمنِ جانی ہوئی

"نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی"

ولہ

ٹک تو فرصت دے کہو ہیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب تسلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانندِ شرر جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ مکنت
شکر ہے، تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

۴۔ اُمید

اُمید تخلص، نام اصلی اس معدنِ کمالات کا مرزا محمد رضا ہے، رہنے والا ہمدان کا، ایام شباب میں وطن سے غربت اختیار کرکے وارد اصفہان کا ہوا ہے، اور میرزا طاہر سے کہ وحید جن کا تخلص تھا، نسبت شاگردی کی درست کرکے کسب کمالوں کا کیا ہے۔ آخر سلطنت میں خلد مکان[1] کے ہندوستان میں آیا، اور اول بادشاہت میں بہادر شاہ

[1] یعنی اورنگ زیب عالمگیر ۱۲

کے خطاب قزلباش خاں کے ساتھ رتبہ منصب ہزاری کا پایا، لیکن اس پائے سے ہمیشہ اس ایام میں شکوہ مند رہا ہے، اور منصب ہزاری کے مضمون کو ایک بیت میں اس طرح سے موزون بھی کیا ہے[۵۱]+

مثل بلبل کے ہوں سدا نالاں　　　یہ مرا منصب ہزاری ہے

محمد معز الدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور کو گیا، اور صوبہ داری میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کی اس خدمت سے تغیر ہو کر خجستہ بنیاد میں حاضر ہوا+

اس جگہ تھوڑا سا احوال مجمل سید حسین علی خاں کی امیر الامرائی کا، اور صوبہ داری دکن کی جلوہ فرمائی کا، بیان کرنا ضرور ہے، کس واسطے کہ تغیر ہونا قزلباش خاں کا بخوبی معلوم ہوگا جب کہ ۱۱۳۲ھ گیارہ سو بتیس ہجری میں محمد فرخ سیر اور محمد معز الدین سے لڑائی ہوئی، تو سادات بارہ نے کمال جانفشانی کی، چنانچہ سید عبد اللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے، مع اپنے بھانجے بھتیجوں اور رفیقوں کے، حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بہادر خاں کے بیٹے کو، مع اُن کے رفیقوں کے، شریک کر کے بلا جو کیا، تو زنجیر سے توپخانے کے گھوڑوں کو کدا کدا کے مقابل ذوالفقار خاں کے، کہ بیٹا اسد خاں وزیر کا تھا، جا پہنچے، اور گود کود کے گھوڑوں پر سے جیسی چاہئے تھی جاں نثاری کی، اور داد مردانگی اور شجاعت کی دی۔ اس میں توپیں بند ہو گئیں تھیں، باقی فوج سے بھی تن دہی ہوئی۔ حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بیٹا بہادر خاں کا، یہ دونوں سردار مع اپنے رفیقوں کے بہادری کا حق ادا کر کے، کام آئے، اور سید حسین علی خاں چور ہو کر کھیت میں بیٹھ گئے۔ اتنے زخم اُٹھائے، بارے سادات کے سر اڑانے سے پانوں طرفِ ثانی کے اُٹھ گئے جو مرے سو موئے، اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمد معز الدین نے اپنی صورت بدل کر راہ دلّی کی لی، اور محمد فرخ سیر کو اللہ تعالیٰ نے سادات کی نمک حلالی سے سلطنت عطا کی۔

---

۵۱ مثل بلبل ہمیشہ نالانم + این بود منصب ہزاری ما +

سید عبداللہ خاں، بھائی کو زخمی کھیت میں چھوڑ کر، فوج کا تعاقب کیئے چلے گئے ہیں، اور بادشاہ بعد ایک ہفتہ کے داخل دلی میں ہوئے ہیں۔ اس جانبازی کے عوض میں بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کو وزیر اعظم کیا، اور قطب الملک یار وفادار سید عبداللہ خاں بہادر ظفر جنگ خطاب دیا۔ اور سید حسین علی خاں کو میر بخشی ہونے کے سوا منصب ہفت ہزاری عنایت ہوا، اور امیر الامرا سید حسین علی خاں بہادر فیروز جنگ خطاب ملا۔ بعد اس فتح کے جو خدمتیں کہ ان سے ہوئی ہیں، اور جو نمک حلالیاں کہ اُنھوں نے کیں ہیں مفصل بیان اس کا موجب طول کلام کا ہے، اور کچھ متعلق بھی نہیں اس مقام کا ہے۔ غرض توجہ بادشاہ کی ازبسکہ ان پر حد سے زیادہ تھی، حاسدوں کو بس یہی عداوت کی بنیاد تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں بدگویوں نے ان کی طرف سے بادشاہ کے دل میں سیکڑوں شبہے ڈال دیئے، غضب تو یہ ہے کہ اس عقل مجسم نے حاسدوں کے کہنے سے بے تامل مان لئے پھر تو دشمنوں نے تدبیر ان کے توڑنے کی یہ ٹھیرائی، کہ پہلے لازم دونوں بھائیوں میں ڈالنی جدائی۔ اس تقریب سے امیر الامرا سید حسین علی خاں کے واسطے تجویز صوبہ داری دکھن کی ہوئی، اور رخصت حضور سے ۱۱۲۷ گیارہ سو ستائیس ہجری میں اس مروت کے معدن کی ہوئی۔ ابھی دس کوس بھی دکن کی سمت کو نہیں گئی تھی سواری گئی، کہ ساری دلی پکارتی تھی "جگ چھوٹا اور رزد ماری گئی"۔ قصہ مختصر بعد کتنے دنوں کے، اور طے کرنے منزلوں کے، جب نربدا سے عبور ہوا تو ایک فوج عالی شان لے کر واسطے لڑائی کے سامنے داؤد خاں ناظم برہان پور ہوا، کیونکہ فرمان بادشاہی معرفت خان دوراں خاں کے اس کو آگے ہی پہنچ چکا ہے، کہ دفعیۂ میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کے اگر تجھ سے قصور ہوگا، تو گنہگار حضور کا ہو۔ سبحان اللہ! یہ داؤد خاں وہی ہے، کہ اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کے امیر الامرا نے اس کی جان بخشی کروائی ہے، اور احمد آباد گجرات سے اس کو باہر بھجوا کے سند صوبہ داری برہان پور کی حضور سے اس کے نام بھجوائی ہے۔ وہ حق احسان فراموش کر کے جان بخشی کے عوض میں خواہان جان ہوا۔

چنانچہ ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں، گیارھویں تاریخ رمضان کی، لڑائی کا آراستہ میدان ہوا۔ بعد بہت سی خونریزی اور کشاکشی کے داؤد خاں نے بندوق کی گولی کھائی، بساط ہستی کی گنوائی، اور امیر الامرا فیروزجنگ نے ساتھ فتح اور فیروزی کے اورنگ آباد میں داخل ہوکر مسند حکومت کی آرایش فرمائی۔ اس حرکت سے کہ برہان پور کے ناظم سے ہوئی تھی، آتے ہی اہلِ خدمت برہان پور کے سب تغیر کئے۔ اس تقریب سے قزلباش خاں بھی معزول ہوکر حضور میں حاضر ہوئے۔ ازبسکہ سلیقہ علم مجلس کا اس مجموعۂ کمالات کو بہت بڑا تھا، اور مزاج دانی میں اُمرا کے بہ شدت دخل رکھتا تھا، طرز خدمت اس کی امیر الامرا کو نہایت پسند آئی، اور داروغگی حکومتِ کرناٹک کی واسطے قزلباش خاں کے قرار پائی۔ اس تقریب سے ارکاٹ کو گیا، اور ایک مدت بھر وہیں رہا۔ بعد زوال دولت سادات کے، کہ وہ قصہ مشہور ہے، اور یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے، قزلباش خاں نے رفاقت مبارز خاں کی، کہ ناظم حیدرآباد کا تھا، اختیار کی۔

چنانچہ ۱۱۳۷ھ گیارہ سو سینتیس ہجری میں، جب نواب نظام الملک آصف جاہ سے اور مبارز خاں سے میدان میں شکر کھیڑی کے، کہ سات کوس اورنگ آباد سے ہے، لڑائی ہوئی، تو قزلباش خاں بھی ساتھ تھا۔ مبارز خاں تو صیدِ اجل کا نخچیر ہوا، اور قزلباش خاں دامِ ہستی میں پھنس کر دستگیر ہوئے۔ بعد کئی دن کے ایک غزل نواب کی تعریف میں، اور اپنے عذر تقصیر میں لکھ کر بھجوائی۔ بندش اس غزل کی نواب آصف جاہ کو پسند آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پھر توایسی موافقت آئی، اسی وقت بموجب حکم قید سے نجات ملی، اور جاگیر قدیم بدستور سابق بحال ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر توایسی موافقت آئی کہ قلعہ داری منی مرگ کی نواب نے عنایت فرمائی۔ یہ قلعہ ہے علاقہ میں کرناٹک کے، وہاں ہیرے کی کھان تھی۔ چنانچہ کشنا جو ندی ہے، اس کے کنارے سے ہیرا نکال کے وہاں تراشتے ہیں۔ چندمدت اس معدنِ معانی نے ہیرے کی کھان کی داروغگی میں اوقات نہایت

آب و تاب سے بسر کی، اور اسی عرصہ میں رخصت حج اور زیارت کی لی۔ بعد حاصل کرنے سعادت زیارت کے جو آیا، تو نواب آصف جاہ کو ویسا ہی توجہ اور عنایت کے ساتھ پایا۔ جب کہ سنہ ۱۱۵۰ گیارہ سو پچاس ہجری میں نواب آصف جاہ حضور طلب ہوئے، اور شاہ جہان آباد آئے، تو قزلباش خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ اس میں کچھ شورش مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے مامور ہوئے، اور قزلباش خاں اس سفر میں فقط پاس رفاقت کرکے جدا ولی سے مجبور ہوئے

میر غلام علی آزاد تخلص، سرو آزاد جو اُن کا تذکرہ ہے، اُس میں لکھتے ہیں، کہ جن ایام میں نواب آصف جاہ کو بھوپال کے سفر کا اتفاق ہوا، تو فقیر بھی عازم حج کا تھا۔ اس قافلے کے پہنچنے کو عنایاتِ الٰہی سے سمجھ کر چلنا راہ کا اور اُترنا منزلوں کا باہم اختیار کیا۔ چنانچہ قزلباش خاں سے مکرر اور متواتر ملاقاتیں اس سفر میں ہوئیں۔ عجیب مجمع کمالات نظر آیا۔ باوصف ولایت زائی کے ہندی راگوں کے گانے اور سمجھنے میں نہایت طبع چست اور فہم درست رکھتا تھا، اور خوش اختلاطی اور رنگین مزاجی میں بھی کوئی مقام اس سے نہیں چھوٹتا تھا۔ یہ لطیفہ اس کی زبانی ہے کہ ”ایک دن میں نے کچھ شکایت زمانے کی نواب ذوالفقار خاں بیٹے نواب اسد خاں، وزیر جو تھے، اُن کے سامنے کی، سُن کر فرمانے لگے کہ ”سچ ہے دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں“۔ میں نے عرض کی کہ ”اگر دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں تو افسوس ہے آپ مجھ بغیر دنیا کو بسر کرتے ہیں، کہ میرا تخلص ”اُمید“ ہے“۔ غرض جب نواب آصف جاہ بھوپال میں پہنچے، تو فوج نے مرہٹے کی شدتیں کیں، اور لڑائیاں مکرر ہوئیں۔ اس میں نادر شاہ کے آنے کا غلغلہ ہندوستان کی طرف ہوا۔ نواب آصف جاہ نے اس ایام میں لڑائی کا طول دینا مناسب نہ سمجھ کے، ساتھ دارو مدار کے مصلحتاً صلح کی، اور مع قزلباش خاں کے داخل شاہ جہان آباد میں ہوئے۔ آگے نادر شاہ کا آنا، اور دلی کا لوٹے جانا، مشہور ہے، یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے۔ غرض جب والی ایران کا ایران کو گیا، اور شہر میں امن و امان ہوا، تو آصف جاہ حضور سے رخصت ہو کر پھر دکن کو سدھارے، اور قزلباش خاں نوکری

چھوڑ کر کمر کھول کر بیٹھ رہے، دلّی کی محبت کے مارے چند روز اَور بھی ساتھ عیش و نشاط کے دیکھا جلوہ دم اور قدم کا، آخر ۱۱۵۹ء گیارہ سو اُنسٹھ ہجری میں سکتے کی بیماری سے لاچار کیا سفر ملک عدم کا۔ تقریب آٹھ ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس بلند طبع نے فکر کی ہے، اور ہندی میں گاہ گاہ بطور اختلاط کے کبھی کوئی غزل کہی ہے۔ یہ اشعار اُس ستوده اطوار کے ہیں +

	با ناز و رو حُسنِ ملک، جلوۂ پری۔ رفتم بہ پیش و گفتم "جانم فدائے تست" ایسی نہ سیتا، اور نہ بھوانی نہ رادھکا گفتم کہ "تیرے پانوں پڑم اور بلا لیم"	باہمن کی بیٹی ایک مری آنکھ میں کھڑی (برہمن) غصّہ کیا، دگالی دیا، اور دگر لڑی کرتار[۵۲] نے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی (یعنی پھر) گفتا کہ "ڈاڑھی[۵۳] جار مغل تجھ کو کیا پڑی"	

گفتم "اُمیدِ وصل پہ ہم تیرے جیتا ہوں"
گفتا کہ "وصل پرے دئی مارے تجھے مری"

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے دل ہمارا سے کرتا ہے رات دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا دہر میں پاسِ نفس لازم ہے	ولہ	در و دیوار سے اب صحبت ہے غیب سے جو ہر شب صحبت ہے ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار
آج اُمید کو ڈھب[۵۴] صحبت ہے

۵۱ اور تذکروں میں "کھڑی" کی بجائے "پڑی" ہے جو "در نظرم افتاد" کا ترجمہ ہے ۱۲

۵۲ کرتار یعنی خدا ۱۲

۵۳ یعنی ریش سوختہ ۱۲

۵۴ یعنی کذھب ۱۲

۵- آرزو

آرزو تخلص ہے، سراج الدین علی خاں نام، متوطن اکبر آباد کے۔ باپ کی طرف سے سلسلہ اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین، بھانجے سے شیخ نصیر الدین کے، کہ چراغ دہلوی جنکا لقب تھا، ملتا ہے، اور ماں کی طرف سے شیخ فرید الدین عطار نیشا پوری کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی۔ چنانچہ چودھویں برس شعر کہنا شروع کیا، اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا، فاضلوں سے عصر کے جس قدر کہ فائدہ چاہیئے تھا اُٹھایا اور مرتبہ کو استعداد کے نہایت بلندی کو پہنچایا۔ بعد تحصیل علم کے بادشاہی منصب داروں میں داخل ہو کر وطن سے دور رہا، یعنی اوائلِ سلطنت میں محمد فرخ سیر کی گوالیر کی خدمتوں میں سے ایک خدمت کے ساتھ مامور ہوا، سنہ ۱۱۳۰ھ گیارہ سو تیس ہجری تھی کہ دار الخلافہ ہندوستان میں آیا، اور زور شور شاعری کا زباں دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ ۱۱۴۷ھ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں، کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہ جہان آباد میں تشریف لائے، تو اُس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب اُن کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی، اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھیرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا ہے، اور نام اُس کا "تنبیہ الغافلین" رکھا ہے[۱]۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں تو صاف نزاع معلوم

---

[۱] مولوی امام بخش صہبائی نے ایک رسالہ قولِ فیصل عام لکھا ہے، جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جواب دیئے ہیں ۱۲

ہوتی ہے، جیب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جالڑتی ہے۔ غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا، اکثر مضمون میں سے مضمون کو کرتا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت مشّاق، خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اگرچہ سر رشتہ ملاقات کا ان کو ایک جہان سے تھا، لیکن توسّل امورات دنیا میں نواب اسحٰق خاں سے تھا۔ بعد خرابی کے شاہ جہان آباد کے نواب سالار جنگ کے ایما سے لکھنؤ میں آئے، لیکن فلک نیرنگ باز نے بیرنگی ہی کے رنگ دکھائے، چنانچہ لکھنؤ میں وصال ہوا ہے، اور لاش کو اُن کی، بموجب اُن کی وصیت کے، نواب سالار جنگ نے بعد سپردگی شاہ جہان آباد کو بھجوا دیا ہے۔ بہت سی کتابیں اس ماہر فنون نے تالیف کی ہیں۔ اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کے بھی گزرے ہیں:۔ فن معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اُس کا "موہبتِ عظمیٰ"[۵] ہے۔ اور فن بیان میں ایک رسالہ اس کی تصنیف سے مشہور "عطیۂ کبریٰ" ہے۔ اور ایک فرہنگ لکھی ہے، کہ نام اُس کا "سراج اللغت" ہے، بطور برہان قاطع کے۔ اور سوائے اس کے حال کی اصطلاحات میں ایک نسخہ تالیف کیا ہے، کہ مشہور ہے "چراغ ہدایت" کر کے۔ شرحِ اسکندر نامہ کی اور قصائد عرفی کی لکھی ہے۔ اور گلستاں کی شرح، کہ نام اُس کا "خیابان" ہے، تالیف کی ہے۔ ایک تذکرہ[۶] فارسی گویوں کا نہایت لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔ سوائے اس کے اور بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ ۱۱۶۹ھ گیارہ سو انہتر ہجری میں اس فراغ پڑھنے والے مدرسہ زندگی کے نے کتاب ہستی کو گردان کے اُستاد اجل سے درس فنا کا پڑھا۔ قریب تیس ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس کو کہنے کا اتفاق ہوا ہے، اور ریختہ کا قصد گاہ گاہ بطریق تفنن کے کیا ہے۔ یہ اشعار ہندی طبع زاد اُس کے مشہور ہیں:

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے	وله	زاہد نے آج اپنے دل کے پھپولے پھوڑے	
جان کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں		زندگانی کا کیا بھروسا ہے	

[۵] یہ رسالہ چھپ گیا ہے ۱۲ [۶] اس تذکرے کا نام مجمع النفائس ہے ۱۲

آتا ہے صبح اٹھ کے تیری برابری کو ۔۔۔ کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک ۔۔۔ کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو
اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہے جب سے ۔۔۔ ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو
اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے ۔۔۔ بادِ صبا یہ کہنا اس دل ربا پری کو
آب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو"

وله

فلک نے رنج تیر آہ سے میرے زبس کھینچا ۔۔۔ لبوں تک دل سے شب نالے کو میں نے نیم رس کھینچا
مرے شوخِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو ۔۔۔ بہارِ حُسن کو دی آب اُس نے جب چرس کھینچا
رہا جوش بہار اس فصل گریوں ہی تو بلبل نے ۔۔۔ چمن میں دستِ گلچیں سے عجب رنج اس برس کھینچا
کہا یوں صاحب محمل نے سُن کر سوز مجنوں کا ۔۔۔ "تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثلِ جرس کھینچا
نزاکت رشتۂ اُلفت کی دیکھو سانس دشمن کی
خبردار آرزو تک گرم گرتا نفس کھینچا

۶- آبرو

آبرو تخلص، شاہ نجم الدین نام، ساکن شاہ جہان آباد- اولاد میں شیخ محمد غوث گوالیری کے تھے- سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ داران قریب میں- اور صاحب دیوان تھے زبان ریختہ کے- ترکیب میں بیشتر اشعار اُنھوں نے ایہام کے کہے ہیں، یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لائے ہیں، کہ جن لفظوں کے دو معنی ہیں، اگرچہ بامعنی یا لایعنی- محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد سلطنت میں اُنھوں نے جہان فانی سے رحلت کی ہے- ان شعروں نے آبرو ان کے دیوان کو دی ہے +

خوبرویوں کے ہواحق میں یہ تب کرنا دوا- ۔۔۔ تیرگی جاتی رہی چہرے کی اور آئی صفا

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن — عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا
تو گلے کس کے لگی، لیکن کسی بے رحم نے — گرم دیکھا ہوگا تجھ کو بیچ میں آنکھوں کے لا
آہِ سرد اور چشمِ تر عاشق کی سے وسواس کر — بد بہت ہے مختلف جس وقت ہو آب و ہوا
دل مرا تعویذ کر تو لے کے اپنے پاس رکھ — تو طفیلِ حضرتِ عاشق تجھے ہووے شفا
ترش روئی چھوڑ دے اور تلخ گوئی ترک کر — اور کھانا جو کہ ہو خوش کا تری[۵۱] سو کر غذا

بو علی ہے نبض دانی میں بتاں کے آبرو
کیوں نہ ہووے عاشقی میں اس کا نسخہ کیمیا

بوسہ لبوں کا دینے کہا، کہہ کے پھر گیا — ولہ — پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

قول آبرو کا تھا کہ "نہ جاؤں گا اُس گلی"
ہو کر کے بے قرار دیکھو[۵۲] آج پھر گیا

وعدے تھے سب خلاف جو اس لب سے ہم تک — ولہ — کیا لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا
یہ سبزہ اور یہ آب رواں اور ابر یہ گھرا — ولہ — دِوانا نہیں[۵۳] کہ میں گھر میں رہوں گا چھوڑ کر صحرا
چوپڑ[۵۴] کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصہ — ولہ — شاید کبھو وہ سر کا بیٹھے ہمارے پاس آ
تم اور گلرخوں سے اب آنکھ جو لگاتے — بادام کو پیارے پھولوں کے بیچ باسا
پی کر شراب جو تم ہم کو ڈراوتے ہو — کیا شوق کو ہمارے جانا ہے اور کا سا
جھپٹ آیا میں رقیبوں کو گویا مار دیا — ولہ — یار نے اپنے گلے کا مجھے جب ہار دیا
سنے کوئی[۵۵] اس طرح کے لالچی کو کب تلک بہلا — ولہ — چلی جاتی ہے فرمایش کبھی یہ لا کبھی وہ لا
میرے پیارے سے قاصد اپنے دل کی بات جا کہنا — ولہ — کہ جانے سے تمہارے جان کو مشکل ہے اب رہنا

۵۱ "خوش کا تری" یعنی "تیری مرضی کا"۔ "خشکہ" کا ایہام بھی مقصود ہے ۱۲ ۵۲ "دیکھو" کو "دِکھو" پڑھنا چاہئے، ورنہ مصرعہ ناموزون ہوگا ۱۲ ۵۳ "نہیں" کو "نہ" کے لہجہ میں پڑھنا چاہئے ۱۲ ۵۴ یعنی چوپڑ کھیلنے سے سارا مقصد یہ ہے ۱۲ ۵۵ قدما "کوئی" کو "کُئی" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے، یہاں بھی اسی طرح پڑھنا چاہئے ورنہ مصرعہ ناموزون ہوگا۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے	وله	کہ اس کو بد نما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا
سیج اوپر غیر کی رہتا ہے اب لوٹا ہوا	وله	زر کے لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا
جو لونڈا[1] نام سُن امرد پرستی کا چڑھے چو نکے	وله	میں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں جوں لاسا
عاشقوں میں جس کسی کا یار ہو راضی مرا	وله	وہ مرا دشمن ہے لیکن چاہتا ہے جی مرا
جس طرح سے اے نامہ بر آیا ہے چلا جا	وله	جا کر کے یہ کہہ کل نہیں آیا ہے تو آجا
فرہاد کا دل کوہ کنے کا بھرا پیالا ہوا	وله	مستی سے جس کی شوق کی ہر سنگ متوالا ہوا
کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہو گی	وله	اس دلِ بے قرار کی صورت
زندگی ہے سراب کی سی طرح	وله	باؤ بندی حباب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو		مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح
آبرو کے قتل کو حاضر ہوا کس کر کمر	وله	خون کرنے کو چلا عاشق پہ تہمت باندھ کر
جس وقت زخم تیر اگتا ہے غیر کے تئیں	وله	اُس وقت جان سیتی جاتے ہیں جان سے ہم
دھمکاؤتے ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر	وله	کھولے ابھی تو جاوے میاں کا نکل بھرم
کن نے آ باغ میں حیران کیا نرگس کو	وله	نہیں معلوم کہ یہ دیکھ رہی ہے کس کو
کہتا ہوں میں پکار، سنو کان دھر سجن	وله	جو اَوروں سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں
ہرگز ترے لبوں کی سرخی کے تئیں نہ پہنچیں	وله	ہر چند سعی کر کر یاقوت و لعل مر جائیں
اک عرض سب سے چھپ کر کرنی ہے ہم کو تم سے		راضی ہو گر کہو تو خلوت میں آکے کر جائیں
لٹک چلنا سجن کا بھولتا مجھ کو نہیں اب تک	وله	طرح وہ پانوں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے
زلف کے عقدے کھلے اب اَور بھی مشکل ہوئی	وله	دل کے اوپر یہ نئے سر سے بلا نازل ہوئی
میاں[2] کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے	وله	کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے
دل کب آوارگی کو بھولا ہے		خاک گر ہو گیا بگولا ہے

[1] اس شعر سے اُس زمانے کی اخلاقی حالت ظاہر ہوتی ہے ۱۲ [2] یہی شعر بہ ادنیٰ تغیر جرأت کی طرف منسوب ہے ۱۲

پھرتے تھی پھرتے دشت دیوانے کدھر گئے	ولہ	وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے	
مژگاں تو تیز تر ہے ولیکن جگر کہاں		ترکش تو ہیں بھرے یہ نشانے کدھر گئے	
نازک تنی پہ اتنے مغرور ہو رہے ہو	ولہ	موسیٰ کمر نہیں تو فرعون کر رکھا ہے	
اُٹھ چپیت (یعنی ہوشیار ہو) کہوں جنوں سی خاطر نچنت کی	ولہ	اے کچھ بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی	

۷۔ احسن

احسن تخلص، میرزا احسن نام، جوان نیک خصلت ہے۔ ابتدا میں میر رضا سے اتفاق اصلاح کا ان کو ہوا ہے۔ بعد اس کے میرزا محمد رفیع السودا سے مشورۂ سخن کا کیا ہے ریختہ ان کا خالی کیفیت سے نہیں ہے، اور بندش شعر کی صاف اور شیریں ہے۔ فی الجملہ غربت بھی رکھتے ہیں، اور نستعلیق وغیرہ اکثر اقسام خطوط بھلے چنگے لکھتے ہیں۔ ابتدا میں وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کی سرکار میں سررشتہ ملازمت کا رکھتے تھے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک مدت سے نواب سرفراز الدولہ میرزا احسن رضا خاں بہادر کی رفاقت میں ایام زندگانی کے بسر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں بود و باش ہے۔ اور یہ ان کا منتخب تلاش ہے +

ہجر میں کیوں کر نہ ہووے آہ و زاری بیشتر		ہے قرار اس دل میں کم و بیقراری بیشتر
کیوں تفکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے		یاد رہتی ہے ہمیں پیارے تمہاری بیشتر
پیشتر تھی ہم کو اُس سے دوستی اک طرح کی		اب تو بتلاوے ہے تلوار و کٹاری بیشتر
روز ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم		وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر

بن کے خاک اب اُس کے کوچے سے بھلا کیونکر اُٹھو
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری بیشتر

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہ حزیں ہے		کوئی دم ہے یاں، سو دم واپسیں ہے
گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا		ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چین جبیں کے — نہ پھر وہاں سے نکلا عجب سرزمیں ہے
قدم رکھے نہ اپنا مرے دل سے باہر — کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے

نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

وله
یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا — رام اُس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا

وله
سر اپنے کو جیوں لے گئے ہم اُس کے قدم تک — پہنچا دیا ٹھوکر میں وہیں ملک عدم تک

وله
سجدہ گہ ہے خاک احسن اب تو سارے خلق کی — جان دی تھی اُس نے کس کی حسرت پابوس میں

وله
دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو — چشم میں روشنیِ طور سے بھی نور نہ ہو
بزم میں اُس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی — دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو

وله
ہے مجھ میں رمق، دیدہ تجھے تا نگراں ہے — جیوں شمع مرا تار نگہ رشتۂ جاں ہے

وله
محرم ہم ہوں، محرم اسرار ہو کوئی — خلوت میں ہو کوئی، پس دیوار ہو کوئی
راتوں کو اُس کے کوچہ میں جاتا تو ہوں ولے — دھڑکے ہے دل پڑا کہ نہ بیدار ہو کوئی

وله
پہنچی جس وقت مجھے اس کی خبر آنے کی — سدھ رہی مجھ کو نہ اپنے کی نہ بیگانے کی
تم تو دل مانگو ہو، یاں جان تلک حاضر ہے — بات یہ بھی ہے کوئی آپ کے فرمانے کی

۸- الہام

الہام تخلص، شیخ شرف الدین نام، لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے ہیں۔ صغر سن ہے، دیکھتا ہوں ان کو، اسباب دنیا سے قانع بہ یک چادر ہیں، اور سر و پا برہنہ بیٹھے رہتے خاک پر ہیں۔ زود گوئی کی مشق اس مرد کو حد سے افزود ہے، یہاں تلک کہ ایک مصرع نہیں لکھا جا چکتا کہ دوسرا موجود ہے۔ اسی طرح سو سو بیت تک ایک دریا جوش مارتا چلا جاتا ہے، لیکن اس زود گوئی کے باعث سے اکثر کلام ان کا گفتگو میں بھی آتا ہے۔ دو دیوان فارسی زبان میں

رکھتے ہیں، اور ہندی میں بھی اکثر کچھ کچھ کہتے ہیں۔ آگے ملول تخلص کرتے تھے، اب تخلص الہام ہے۔ بیشتر اہل لکھنؤ کو، شاگردی کے سوائے، ان سے اعتقاد تمام ہے۔ یہ غزل ان کی جو لکھی جاتی ہے، البتہ ایک عالم کو اضطرارِ دل کا دکھاتی ہے +

دیکھا نہ ہو جس نے کبھو سیماب کا عالم	آ دیکھے وہ میرے دلِ بیتاب کا عالم
اے ابرِ مژہ ناصحوں کی ضد سے تو یکبار	سب ارض و سما آوے نظر آب کا عالم
یاقوت کی رنگت پہ کبھی آنکھ نہ جاوے	دکھلاؤں اگر چشم کے خوناب کا عالم
گل پرتوِ حسنِ رخِ دلدار کے آگے	پھیکا نظر آیا ہمیں مہتاب کا عالم

مانی تر او اللہ ؎ ہو بندا
کھینچے تو اگر دل کے تپ و تاب کا عالم

اری بیکسی تیرے قربان ہوں	ولہ	برے وقت میں ایک تو رہ گئی

۹-اثر

اثر تخلص، میر محمد نام، شاہ جہان آبادی۔ چھوٹے بھائی تھے خواجہ میر درد مرحوم کے، واقف تھے فن تصوف سے، اور آگاہ تھے علمِ معرفت سے۔ بطور درویشان صاحب معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی، اور درد و اثر کے ساتھ نہایت طبیعت ہموار کی تھی۔ بھائی سے اپنے اُنھوں نے کسب کمالوں کا کیا ہے، سچ تو یہ ہے کلام ان کا چاشنی سے درد و اثر کی آشنا ہے۔ ایک مثنوی بہت طولانی بیان عشق میں ان کی تصنیف سے ہے، اگرچہ انتخاب اس کا لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے +

آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا		آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا
میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ	ولہ	پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

؎ اصل نسخہ میں سادہ جگہ چھوڑ دی ہے غالباً "یہ الہام" کا لفظ تھا ۱۲

بس ہو یارب یہ امتحان کہیں	وله	یا نکل جائے اب یہ جان کہیں
وائے غفلت! کہ ایک ہی دم میں		میں کہیں، اور کاروان کہیں
بے وفا تجھ سے اب گلا ہی نہیں	وله	تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں
یا خدا پاس، یا بتاں کے پاس		دل کبھی اپنا یاں رہا ہی نہیں
دل سے جو چاہئے سو باندھئے بات		میں نے واللہ کچھ کہا ہی نہیں
تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں	وله	پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
دردِ دل چھوڑ جائیے، سو کہاں؟		اپنے باہر تو یہاں گذر ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھئے مجھ سے		بات میری تو معتبر ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں	وله	ہیں سب وگرنہ یہ تری باتیں نگاہ میں
ہم ہیں بیدل، دل اپنے پاس نہیں	وله	آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
پوچھ مت حالِ دل مرا مجھ سے		مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر		مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

میں کہاں تو کہاں، یہ کہتے ہیں	وله	کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں
جو سزا دیجے، ہے بجا، مجھ کو	وله	تم سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

ایک تنہا خاطرِ محزوں، جیسے آزار سو	وله	ایک مجھ بیمار سے وابستہ ہیں آزار سو

کچھ ان روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے	ولہ	اسی حالت میں لیکر صبح سے تا شام رہتا ہے
بیاں میں کیا کروں اب اس سے آگے اپنی ناکامی		ترے یہ طور، اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہے
اثر کیجئے کیا، کدھر جائیے	ولہ	مگر آپ ہی سے گذر جائیے
کبھو دوستی اور کبھو دشمنی		تری کون سی بات پر جائیے
صرفِ غم ہم نے زندگانی کی	ولہ	واہ کیا خوب زندگانی کی!
ناک تیری عجب سجیلی ہے	ولہ	پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے
ناک ہے، یا کہ ایک توتا ہے	ولہ	چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
نتھنے ایسے ترے پھڑکتے ہیں		جانور وحشی جیوں پھڑکتے ہیں
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں		شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں		دل کلیجا سبھی چباتے ہیں
دیکھ کر آنکھیں آبدار کو یہاں		لوٹ جاتا ہے گوہرِ غلطاں
گر کبھو اس کے جی میں آوے ہے		مسی دو انگلیاں لگاوے ہے
دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے		رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے
جب خیال آبندھے ہے گردن کا		یہاں ڈھلک جائے ہے مرا منکا
گو کہ شفاف ہے تنِ مینا		یہاں تو جھکتی ہے گردنِ مینا
کیوں نہ کھینچے وہ سب سے آپ کو دور		جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور
دھیان میں جب وہ بازو آتے ہیں		ہاتھ پاؤں اپنے پھول جاتے ہیں

کیا خوش آیند یہ کلائی ہے
اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

۱۵ مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے ۱۲

۱۰-الم

الم تخلص، صاحب میر نام، شاہ جہان آبادی۔ خلف الصدق خواجہ میر درد مرحوم کے۔ درویش صاحبِ حقیقت اور پہچاننے والے رموز معرفت کے ہیں۔ ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری میں رونق بخش بلدۂ مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور دوستی سے راجہ دولہ رام کی چند مدت اس شہر میں رہے تھے۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہیں، شاہ جہان آباد میں توکل اور قناعت کے ساتھ اوقات شریف کو بسر کرتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں۔

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر
بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگامِ فغاں تھا خس و پنبہ قفس و دام
تارِ رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر

جب نامِ خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو
مرجائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر

مندیل کا تو پیچ اٹھا بیٹھے گا اے شیخ
چھٹ اس کے نہ کچھ پاویگا رندوں سے جھگڑ کر

آجاتا ہے دکھ درد بھلانے کو الم یہاں
کیا اس سے مزاحم ہو اٹھاتے بھلا لڑ کر

رباعی

نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب
نہ چشم کو خواب اشک باری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو
جو کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

۱۱-اشتیاق

اشتیاق تخلص، شاہ ولی اللہ نام، متوطن سرہند کے۔ اس رونق بخشِ دینِ احمدی کا سلسلۂ ارادت شیخ احمد کو، کہ مجدد الف ثانی جن کا لقب تھا، پہنچتا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاہ محمد گل کو جد ان کا لکھا ہے، لیکن راقم حقیر کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب کے نہایت بلند تھا بخصوص علم حدیث اور تفسیر میں بہت

بڑی دستگاہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدۂ روزگار کا زبانِ خلائق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کر کے جاری ہے۔ اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسنین" ہے، اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ"[1] کہتے ہیں تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحہ روزگار پر ہیں۔ والد ماجد ہیں یہ اُس رونق بخش کشور قناعت کے، کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے۔ آج کے دن تک قدمِ توکل گاڑے ہوئے شاہجہان آباد میں بیٹھے ہیں، باوصفیکہ تفضل حسین خاں مرحوم نے موجب ایما صاحبانِ عالی شان کے مدرسہ قدیم کی مدرسی کے واسطے تحریک اس مرکز دائرۂ قناعت کی چاہی، لیکن اس قطبِ آسمانِ ملت و دین نے مطلقاً حرکت جگہ سے نہ فرمائی۔ اس فاروق زماں کی بھی تالیف سے ایک کتاب ہے، کہ نام اس کا "تحفۂ اثنیٰ عشریہ" ہے، اور دوسرا نام "رد روافض" شاید کہتے ہیں سچ تو یہ ہے دیکھے سے اس کتاب کے استعداد اس بزرگ زادے کی معلوم ہوتی ہے، کہ کیا دریا فصاحت کا بہایا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے۔ فی الواقعہ کہ عالی مقداروں کے عالی مقدا ہی ہوتے ہیں، اور نابکاروں کے نابکار، بقول ایک شاعر کے ؎

شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزود ہے ۔۔۔ بھونکنے میں کتے کی بلی کی سگی موجود ہے[2]

الغرض وہ جامع جمیع علوم یعنی شاہ ولی اللہ مرحوم حین حیات میں اپنی کوٹلہ میں فیروز شاہ کے تشریف رکھتے تھے۔ اوقات شریف کو بطور درویشان اہل معنی کے بسر کرتے تھے۔ اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کمتر ہوتا تھا، اور زبان ریختہ کا مشغلہ اکثر۔ یہ اشعار خلاصۂ افکار اُس حقیقت آگاہ کے ہیں ؎

[1] دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدانخواستہ اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں ۱۲

[2] شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب، دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح کی ہے، اور اس شعر نے تو صاف پردہ اٹھا دیا ہے ۱۲

خیال دل کو ہے اُس گل سے آشنائی کا — نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا
کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ — ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا
مجھے تو ڈھو[1] کے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج — غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا
جہاں میں دل نہ لگانے کا لیوے پھر کوئی نام — بیان کروں میں اگر تیری بے وفائی کا
نہ چھوڑا مار بھی کھاکر گذر گلی کا تری — رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا
نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی — غرور ہے جنہیں در کی تری گدائی کا

جفائے یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہہ سائی کا

ولہ: لڑکوں کے پتھروں سے لگے کیونکہ اُسکو چوٹ — پر ایک کر دیا ہے یہ مجنون کو ڈھول کوٹ
ولہ: چھوڑ کر تجھ کو ہمیں غیر سے جو لاگ لگی — نہیں مہندی یہ ترے تلوؤں سے ہے آگ لگی
ولہ: دو بالا ہو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے — پیالہ اور بھی پی پی سجن یہ دور چلتا ہے

۱۲- انشا

انشا تخلص، امیر انشاء اللہ خاں نام، بیٹے ہیں حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے، مصدر جن کا تخلص تھا عجب شخص خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے۔ سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبان عربی میں اُنہوں نے نظم کی ہیں، اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ زبان فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ کشمیری اور مارواڑی کے سوائے اور بھی بہت سی بولیوں کے زبان دان ہیں۔ سال گذشتہ اُنہوں نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوط، یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کابل بھجوایا، اور صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت

[1] یعنی طعنہ دیتا تھا ۱۲

سا پایا۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ ہجری ہیں، مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایۂ عاطفت میں لکھنؤ کے اندر اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ دیوان انکا زبان ریختہ میں مشہور ہے، اور کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں +

تم جو کہتے ہو، "مجھے تو نے بہت رسوا کیا" — کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر، میں نے کیا کیا

واسطہ، باعث، سبب، موجب، جہت، کچھ بات بھی — راز وہ کم بخت کیا تھا، میں نے جو افشا کیا

کیا کہا؟ کن نے کہا؟ کس سے کہا؟ کب؟ کس گھڑی؟ — کس جگہ؟ کس وقت؟ کس دم؟ آپ کا چرچا کیا

کچھ پتا بھی؟ نام اس کا؟ شکل کیسی؟ وضع کیا؟ — جس کسی نے آن کر مذکور اس ڈھب کا کیا

گبر ہے وہ؟ یا مسلمان؟ یا نصارا؟ یا جہود؟ — اس طرح کا تذکرہ جس شخص نے میرا کیا

شیخ ہے وہ؟ یا مغل ہے؟ یا کہ سید؟ یا پٹھان؟ — موچھ ڈاڑھی ہے؟ کہ مولا نے اسے کھوسا کیا؟

ہے جواں سا؟ یا وہ امرد؟ یا کہ بوڑھا؟ یا ادھیڑ؟ — مرد ہے؟ یا حق تعالے نے اسے خنثا کیا؟

نوکری پیشوں میں ہے؟ یا اہل حرفہ وہ عزیز؟ — کون ہے جس نے اجی جا سے تمہیں بیجا کیا؟

کس محلے میں رہے ہے؟ ہے کہاں کا وہ خبیث؟ — کوئی شیطاں ہوئے گا جس نے کہ ذکر ایسا کیا

کذب، بہتاں، افترا، طوفان، غلط، بالکل دروغ — میں تمہارا نام لے لے کب بھلا رویا کیا

مرحبا، شاباش، اے رحمت خدا کی، آفریں — میرے حق میں تم نے باور اور کا کہنا کیا

چودھویں تاریخ اک ابر تنک سا تھا جو رات — صحن گلشن میں عجائب سیر میں دیکھا کیا

جھلابلی سی چادر مہتاب، اوپر برق کا — وہ دوپٹا بادلے کا سا جو لہرایا کیا

یوں لگا معلوم ہونے، ہیں یہ دو پریاں بہم — ایک نے گویا کہ سایا دوسری پر آ کیا

بوئے گل بولی کہ "آج آپس میں بدلی اوڑھنی — چاندنی بائی نے بی خیلا سے بہنا پا کیا"

خود بدولت تو نہ آئے، اور انشا رات بھر
آپ بن رویا کیا، لوٹا کیا، تڑپا کیا

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی	ولہ	یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا ہو کچھ بُرا		میری طرف کو دیکھئے! میں نازنیں سہی
آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں		جو بات تجھ کو کہنی ہے مجھ سے یہیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ! انشاؔ سے کیں سہی

بندہ اُسے جب نظر پڑا ہے	ولہ	بولا ہے "چل اُٹھ، اِدھر پڑا ہے"

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اُس کے ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

۱۳- امانیؔ

امانیؔ تخلص، میر امانی نام، خلف ہیں یہ خواجہ آثمؔ کے، جن کا مذکور اوپر ہوا ہے۔ ۱۱۸۱ھ گیارہ سو اکیاسی ہجری میں وارد مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور جناب سید الشہدا کی تعزیہ داری کا شغل ہمیشہ رکھتے تھے۔ مرثیۂ ہندی اپنے کہے ہوئے اکثر ممبر پر کھڑے ہو کر پڑھتے، اور مؤمنین کے تئیں سعادتِ گریہ کی دولت سے داخلِ ثواب کرتے۔ ایک شب جناب سید الشہدا علیہ السلام کی عین تعزیہ داری میں، کہ ۱۱۸۷ھ گیارہ سو ستاسی ہجری تھے، بیہوش ہو کر سیر کرنے والے روضۂ رضوان کے ہوئے۔ حق سبحانہ تعالیٰ مغفرت کرے عجب مرد خوش اعتقاد اور دیندار تھا۔ نشۂ محبت میں اہلِ بیتِ نبوی کے سرشار تھا۔ یہ اشعار یادگار اُس نکوکردار کے ہیں:

اُس کے کوچہ ستی غبار اُٹھا	کون ساواں سے خاکسار اُٹھا
عندلیبو بساؤ اب صحرا	باغ سے موسمِ بہار اُٹھا
ہچکیاں لے گلابیاں روئیں	بزم سے جب وہ مے گسار اُٹھا

عزم رخصت ہوا جب ہی اُس کا
میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا

نہیں جو قدرِ اشک، عالم سے
موتیوں کا مگر وقار اُٹھا

شمع سے سوز امانی پوچھا تیرا
اک دھواں اسکے دل سے یار اُٹھا

وله

راہ تکتے تکتے آخر جیسے آیا تنگ دل
آنکھیں تو پتھرا گئیں، پر وہ نہ آیا سنگدل

ہو چکا ہے غم سے خوں، اب جلد یہ جائے کہیں
خوف ہے یارب! نہ بدلے اور بھی کچھ رنگ دل

قدر جان اس کی کہ اک عالم سے یہ بیگانہ ہو
کر رہا ہے تیر دور پر کھو کے نام و ننگ دل

فندقِ پا کس کی دیکھی آہ! جسکے غم سے آج
قطرۂ خوں ہو بنا رشکِ گلِ اورنگ دل

اپنی آنکھوں آگے کو اس کی گلی میں ہے پڑا
پر امانی آپ سے ہے سیکڑوں فرسنگ دل

وله

گھیرا ہے مجھے غم نے عجب حال ہے جی کا
اے نالۂ دل! وقت ہے فریادرسی کا

سینہ میں جدھر رو ہو ترا پھونک دے اے آہ
تنگ دل سے خبردار! کہ یہ گھر ہے کسی کا

وله

اُس کے کوچہ سے صبا آج اس طرف آئی نہیں
دیر ہوئی وہاں مقیموں کی خبر پائی نہیں

وائے اپنی اس بصارت پر، کہ ہر ذرہ میں آہ!
جلوہ گر ہے آفتاب، اور تاب بینائی نہیں

وله

کونسا دن ہے کہ مجھ کو یاد تو آتا نہیں
کونسا دم ہے، کہ آنکھوں بیچ پھر جاتا نہیں

عشق میں کس کے امانی مبتلا ہے، جس بغیر
تجھ کو نظارہ گلوں کا ان دنوں بھاتا نہیں

وله

چمن سب لہلہاتے ہیں پڑے، بادل برستے ہیں
شتاب آ، ساقیا! ہم بادہ نوشی کو ترستے ہیں

زمانہ جائے عبرت ہے، چمن کا حال چل دیکھو
تجمل جن گلوں کا کل تھا سو وے آج جھڑتے ہیں

مساوی جانیو خوش طالعی و کو نصیبی کو
امانی! منعم و مفلوک سبکے دن گذرتے ہیں

وله

امانی تو ہوا تیغ تغافل ہی ستی بسمل
بھلا بتلائے کس پر کر اب آپ کستے ہیں

وله

ہم ترا نزع تلک جور سہے جاتے ہیں
یاد آویں گے بہت اتنا کہے جاتے ہیں

لے گیا کون مری تاب و تواں کو یک لخت
کہ سب ہی عضو میرے آج ڈھے جاتے ہیں

وائے واماندگی اپنی کہ یہ آنکھوں آگے
کارواں رو میں ہے، ہم پیچھے رہے جاتے ہیں

اثر ہو سنگ میں کیا، کیوں کہ ان کو رام کریں	وله	بتوں کے دل ہو، تو یارب یہ آہیں کام کریں
وہ ایک بار بھی تیری نظر پڑے زاہد		صلاح و زہد رہے یہ، تو ہم سلام کریں
کس کے یہ خار مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں	وله	جو چشم سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں
دیکھ تو کیا ہی وہ بت سنگ دلی پر نازاں	وله	تجھ میں اے نالۂ جانکاہ! اثر ہے کہ نہیں
یار و گردار پہ منصور نہیں دیکھا ہے۔	وله	نوکِ مژگاں یہ مرے لختِ جگر کو دیکھو
صفِ مژگانِ آہو چشم کا ہوں کشتہ، اے یاراں	وله	سر تربت یہ چن دیجو مرے خارِ بیاباں کو
زباں پر راز عاشق کا نہ لانا سر کٹا دینا		سر رشتہ کس سے ہاتھ آیا ہے یہ شمعِ شبستاں کو
میں نے پہلو سے گم کیا تجھ کو	وله	آہ دل! کن نے لے لیا تجھ کو
اشک، آوارگی سے تو نہ تھما		میں نے آنکھوں میں گھر دیا تجھ کو
پنکھوں سے دل پھپھولو کیا سوخت کر رہے ہو	وله	پھوٹو کہیں، کہاں کی آتش میں بھر رہے ہو
اور میانِ خالِ شکر لب پہ تمہارے	وله	بوسہ میں بھی شاید مزۂ تل شکری ہو
اللہ رے صنم! یہ تری خود نمائیاں	وله	اس حسن چند روزہ پہ اتنا غرور ہے۔
دم بدم اس کی خلش سے اب مجھے آزار ہے	وله	دوستاں یہ دل نہیں، پہلو میں میرے خار ہے
چاہ میں کس کی دل ڈبو بیٹھے	وله	آہ! ہم کیسے دل کو رو بیٹھے
کیوں امانی گیا نہ آخر دل		کفِ افسوس اب ملو بیٹھے
آہ اب میرے دم کے ساتھ ہوئی	وله	پاؤں پر عمر کے برات ہوئی
ہم سا جو ناتواں عقبِ کارواں رہے	وله	جوں نقش پا وہیں کہ ہوئے پھر جہاں رہے
صدمے جو پڑے ہیں دل پہ غم کے	وله	آنسو نہیں تھمتے چشمِ نم کے
خوش خواب میں ہیں، مگر جواب تک		جاگے نہیں خفتگاں عدم کے
ہے صبح کو عزمِ رفتنِ یار		ٹک تھمیو آفتاب تھم کے
آنکھیں نہیں موندتی ہیں عجب جی پہ تعب ہے	وله	یارب دل حیراں کو مرے کس کی طلب ہے

دم لینے نہیں دیتے ہیں ہم کے یہ نالے	ولہ	کیا جانئے کیا دل کو مرے درد گُدھ ہے
ہجراں کے شب و روز کا مت پوچھو گذرنا		دن کٹ گیا جوں توں کے، تو پھر رات غضب ہے
مدت سے سروکار غمِ ہجر سے ستی ہے		کچھ عیش سے تو کام نہ آگے تھا نہ اب ہے
نامہ بر کبھیو زمانے کی تڑپ تھی تجھ بن	ولہ	شمع شب دیکھ مجھے صبح تلک روئی ہے
بار ہا منع کیا چھوڑ دے بے رحم کی چاہ	ولہ	باز نہیں آتا، امانی بھی عجب کوئی ہے
سیر گلشن کو میں جاتا تھا جو صیاد مجھے	ولہ	دیکھ کر دور سے بولا کہ "شکار آتا ہے"

۱۴- امین

امین تخلص، خواجہ امین الدین نام، عظیم آبادی۔ عالم دوستی اور اتحاد میں باقرینہ ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم کے یار دیرینہ ہیں۔ شعر فہمی اور سخن رسی میں زمانے کے یادگار ہیں۔ مضمون تراشی اور ادا بندی میں نادر روزگار ہیں۔ ذہن کو ان کے بندش کی صفائی میں نہایت ارجمندی ہے۔ اور طبیعت کو ان کی تلاش معانی میں اپنے ہمعصروں سے بلندی ہے۔ چند مدت نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر کی رفاقت میں اوقات اُنھوں نے بہ کیفیت کاٹی ہے۔ بعد اس روزگار کے قناعت اور جواں مردی کے ساتھ خانہ نشینی میں زندگی بسر کی ہے۔ ایک دیوان چھوٹا سا زبان ریختہ میں ان کی تصنیف سے ہے منتخب اس کا یہاں لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے۔

دنیا میں جو آ کر نہ کرے عشق بتاں کا		نزدیک ہمارے ہے یہاں کا نہ وہاں کا
مانند نگیں آپ سے کاوش میں پڑا ہے		مشتاق جو کوئی ہے یہاں نام و نشاں کا
کرتا ہوں امیں میں تو ثنا اس کی و لیکن		منہ لال ہوا جاتا ہے خجلت سے زباں کا
پردے سے جو وہ شہرۂ آفاق نکلتا	ولہ	تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا
تھا کچھ بھی مناسب کہ نکلوا دیا تو نے		گر صبح نہ نکلا تھا امیں شام نکلتا

ولہ
گھر مرے آنا اگر منظور تھا — آئے ہوتے لطف سے کیا دور تھا
گالیاں جو دیں سو دیں اب بس کیجئے — سن چکے ہم جب تلک مقدور تھا

ولہ
یہ دل خالی نہیں کوئی دم رہے گا — تو جاوے گا تری غم رہے گا

ولہ
جس کا دل آپ نے لیا ہو گا — خاک میں لے ملا دیا ہو گا
ہم کو کیا، گر بہار آتی ہے — دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہو گا
گالیاں غیر سے سناتے ہو — ہاں میاں! تم سے اور کیا ہو گا
مل گیا ہو گا خاک میں جوں اشک — تیری آنکھوں سے جو گرا ہو گا

ولہ
بتاں کے واسطے گھر بار کو اپنے بہا نکلا — یہ طفلِ اشک میرا عاشقی میں بے بہا نکلا

ولہ
وہی مقصودِ دل ہے، اور وہی منظور آنکھوں کا — سرورِ سینہ میں اس کو کہوں، یا نور آنکھوں کا

ولہ
کیا ایک مجھ کو بھاتی ہے برسات کی ہوا — کس کو نہیں خوش آتی ہے برسات کی ہوا
جب آہ سرد بھرتا ہوں کانپے ہے تن امیں — جوں شاخ کو ہلاتی ہے برسات کی ہوا

ولہ
خورشید ترا دیکھ کے منہ کانپ کے نکلا — مہ چادرِ مہتاب میں منہ ڈھانپ کے نکلا

ولہ
شور ہے عالم میں تیرے حسنِ عالم گیر کا — تو ہی ہو گا گر کوئی ہو گا تری تصویر کا۔
عشق کی دولت سراپا میں طلا کے رنگ ہوں — اے مہوس دیکھ لے نسخہ ہے یہ اکسیر کا
چوستا ہے جوں سرِ پستاں کو طفلِ شیر خوار — چابتا رہتا ہے دل پیکان اُس کے تیر کا

ولہ
گر ارادہ نہیں ہے آنے کا — فائدہ اس قدر بہانے کا؟
خط نے مارا ہے حسن پر شب خوں — کیا ہی جھگڑا ہے سوائکا

ولہ
سخت کاوش میں ہوں یہ رنگ نگیں — ایسی نام آوری کا منہ کالا

ولہ
دل مرا سینہ سے یوں لیتی ہے وہ زلف دوتا — اپنے دیوانوں سے کیا رکھتی ہیں یہ زنجیر کھینچ
دیکھتی ہے جب مری صورت کو بل کھاتی ہے زلف — جس طرح مجمر سے لے اخگر کو آتش گیر کھینچ

ولہ
جس طرح شاخ کو ہوتا ہے ثمر سے پیوند — کاش نالے کو مرے ہوئے اثر سے پیوند

یا الٰہی کسی ظالم کے پڑے پنجہ میں		بے طرح پشکہ کو ہے اُس کی کمر
دیکھ بھال اس دل صد چاک کو لیتے ہیں بتاں		میں نے یہ شیشہ کیا کیا ہی ہنر
مرتے ہیں ہم تو اُس کے لب آبدار پر	ولہ	گر آب[۵۱] زندگی ہو تو مارے ہیں
بوسہ دیا تھا، جی میں جو آوے تو پھیر لو		اتنا خفا ہو کس لئے اس
اس شمع رو کے سامنے آتا ہے تو پتنگ		بھاری ہوئے ہیں، کیا تجھے اب
دب نکلتا ہے اگرچہ سب سے ہے بالا پہاڑ	ولہ	دیکھتا ہے جب ہماری آہ کا
کھودیا کوہ کن نے جاں شیریں کے لئے		اس کی فرمایش کا اپنے سر سے
آدیکھے تری زلفِ گرہ گیر ہوا پر	ولہ	جن نے نہ کبھی دیکھی ہو زنجیر
ڈر سے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے		ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر
اُڑتا ہے ہو کے مضطر جا اس کے بام و در پر	ولہ	نامہ مرا کہاں ہے ہے کاغ
ہے نہیں جوہر نمایاں تیغ تیز یار پر	ولہ	لکھ رہا ہے نام مقتولوں کا اس
یار کے مژگاں سے لڑ جاتی ہے یوں تیر نگاہ		جس طرح تروار کوئی آ لگے
دل خیال زلف میں بے خواب و بے آرام ہے		رات ہوتی ہے آئیں بھاری
آئی بہار ہو گئے ہر خارِ راہ سبز	ولہ	لیکن ہوئے نہ آہ یہ بختِ سیاہ
شاداب ہے خط اس کے لب آبدار پر		رہتا ہے گرد جادہ کے اکثر گیاہ
دل میں ترے خیال ہے کس نونہال کا		لب سے آہیں نکلتی ہے ہر ایک آ
یار آیا ہے اب نہ یہ اے چشم	ولہ	دیکھنے دے ذرا تو رہ اے چشم
کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں	ولہ	گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پیے
جی نکلتا ہے، یہ لب یاد میں ہلتے ہیں تری		مرتے مرتے بھی ترا نام لئے
چاک سینہ کا مرے لوگ عبث سیتے ہیں	ولہ	ہم تو زخمی ہیں نگاہوں کے، کوئی

[۵۱] "آب زندگی" سے "آب حیات" مراد ہے جس پر خضر کا قبضہ کہا جاتا ہے ۱۲

سیل آتی ہے تو آنے دو مرا کیا لے گی ‏— گھر میں ایک میں ہوں پڑا، اور کئی بہتے ہیں
فائدہ کیا ہے بھلا ہم جو کریں فکر معاش ‏— غم کو کھاتے ہیں امیں خون جگر پیتے ہیں

وله
سر پہ خوباں جو بال رکھتے ہیں ‏— مو بمو جی کا کال رکھتے ہیں
سرو پر اتنا بھول مت قمری ‏— ہم بھی اک نونہال رکھتے ہیں
دل تو کیا ہے، امیں جو آوے یار ‏— جان آگے نکال رکھتے ہیں

وله
بتاں مجھ سے کہتے تھے کیا کچھ نہیں ‏— ولیکن جو دیکھا، تو تھا کچھ نہیں
میں بوسہ جو مانگا، جو جھنجلا کے وہ ‏— لگا کہنے کیا ہے، کہا کچھ نہیں

وله
مجھے بے چین رکھتا ہے دل انکا پہلو میں ‏— وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں
گرفتاروں کو تیری زلف کے کس طرح خواب آوے ‏— بسان شانہ رہتا ہے اُنہوں کے خار پہلو میں

وله
مجھے تو کبھی عمر بھر غم نہ ہو ‏— ملاقات تیری اگر کم نہ ہو
میں درگذرا صاحب سلامت سے بھی ‏— خدا کے لئے اتنا برہم نہ ہو
ہم آنے کو مانع نہیں غیر کو ‏— پر اتنا بھی خلوت میں ہر دم نہ ہو
امیں کی غذا آہ ہی ہے یہی ‏— الٰہی یہ خونِ جگر کم نہ ہو

وله
ہوئی ہے آشنائی جب سے اس مے نوش سے مجھ کو ‏— جو صاحب عقل ہیں کہتے ہیں اہل ہوش سے مجھکو
بھلا تو ہی کہہ اے دل کسی کو یہ توقع تھی ‏— نکالے گا وہ ہم عہدیوں آغوش سے مجھ کو
جدائی سے سراپا رنگ میرا زعفرانی ہے ‏— کوئی لے کر ملا دے اس بسنتی پوش سے مجھ کو
بھڑکتا ہے جگر میرا دل پر داغ کے دولت ‏— امیں جلنا پڑا اس آتشِ خاموش سے مجھ کو

وله
کیا کہیں دودِ آہ کی تاثیر ‏— گھر کا گھر ہے سیاہ، مت پوچھو
مفت مارا گیا ہزار افسوس ‏— تھا امیں بے گناہ مت پوچھو

وله
جب دکھاتا ہے وہ شرابی آنکھ ‏— وہ نہیں جاتی ہے گلابی آنکھ
لختِ دل گتھ رہیں ہیں مژگاں سے ‏— ہے مگر خانۂ کبابی آنکھ

روشن ہیں شب ہجر میں یہ دیدۂ بیدار
دھڑکے ہے مرا دل کہ کہیں کچھ نہ لگا دیں

ولہ

جوں زلفیں چمکنے میں ترے کان کے موتی
لگتے ہیں ترے کان سے جب آن کے موتی

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
صبح گر صبح قیامت نہو، تو کچھ پروا نہیں
تیری آنکھوں کی پرستاری میں دل گھبرا گیا
اس زمانہ میں ایں مت کر کسی سے دوستی

ولہ

عمر کٹنے کو کٹی، پر کیا ہی خواری میں کٹی
ہجر کی جب رات ایسی بے قراری میں کٹی
ہائے اس بیمار کی بیمار داری میں کٹی
شمع کی گردن، نہ دیکھی دوست داری میں کٹی

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے
دھڑکے ہے دل کمر کو جو کستے ہوا ے میاں

ولہ

بلبل کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے
باریک بال سے ہے، تا بال سے باندھئے

جلوہ ترے حسن کا کہاں ہے

ولہ

یوں کہنے کو آفتاب ہاں ہے

ہم رہیں دیکھتے اور تیری یہ اوقات کٹے
ایک دم ہوگئی گر اُس سے ملاقات تو کیا

ولہ

اور تو کیا کہوں اے شانہ ترا ہاتھ کٹے
زندگی کا ہے مزا یہ کہ مساوات سکھے

رنگ چہرے کا زعفرانی ہے
کس سے تشبیہ دیں بھلا تجھ کو
شمع رویاں سے اتنا گرم نہ مل
رات دن بھیکتے ہی جاتا ہے

ولہ

عاشقی کی یہی نشانی ہے
دیکھا یوسف تو تیرا ثانی ہے
ان کی جو بات ہے زبانی ہے
کیا ایں ایسی زندگانی ہے

خضر نے ایک دم پیا تھا لے کے آب زندگی
کیا بھلا اس میکدے میں جی کسی کا شاد ہو
معنیٔ آرام کیا ہے، تو نہ کچھ سمجھا ایں

ولہ

مانگتے ہیں اب تلک اُس سے حساب زندگی
مرگیا آخر کو پی جن نے شراب زندگی
ہم تو مدت سے اُلٹتے ہیں کتاب زندگی

غیر سے کیوں کہ وہ چھوڑے ملنا

ولہ

چھوڑتا ہے کوئی اپنے بانے

ہم کھڑے تھے سامنے، اور اغیاروں میں تھے
جتنے تھے محفل میں، تھا سب سے تپاک اور اختلاط

ولہ

ٹک تو منصف ہو جئے، ہم کبھی یاروں میں تھے
ایک ہم کم بخت گویا واں گنہگاروں میں تھے

ہاتھ اٹھانا جان سے پیارے نپٹ دشوار ہے		کیوں نہ دیکھا کل سب ہی تو ناز برداروں میں تھے
بھر عمر گدائی میں بھی کرتے رہے شاہی	ولہ	دنیا میں جو ٹھاٹھ تھے میاں، ہم نے نباہی
خط کو جو تراشے ہے بھلا فائدہ کیا ہے		اب چڑھ چکی اے یار سپیدی پہ سیاہی
کیا دین سے غافل ہیں ایسیں مردم دنیا		سکہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی
تمہاری آنکھیں جو دیکھتے ہیں، نپٹ ہی لگتی ہیں پیاری پیاری	ولہ	پر اس قدر ہیں جو خوں کی پیاسی، یہ کافر آنکھیں ہیں یا کٹاری
تری نگہ کے جو ہوں گے مارے، نہ مانگا ہو کا انہوں نے پانی		نہ ایسی دیکھی ہے تیغ ہم نے، نہ ایسی دیکھی ہے آبداری
اظہار نہیں اگرچہ سر کا	رباعی	پر بوجھ اتاروں ہوں میں اپنے سر کا
سائل کو جواب ترش ہرگز مت دے		بھوکا ہے، کیا کرے گا لے کر سر کا
یہ جور و جفا یہ بے وفائی کب تک	رباعی	بس کیجئے، پاس آشنائی کب تک
کرتا ہے کوئی حسن پر اتنا بھی غرور		دیکھیں تو رہے ہے یہ خدائی کب تک
کیا شہر میں آج مجھ پر ہے ہولی۔	رباعی	پھرتے ہیں لئے عبیر بھر بھر جھولی
وعدے سے کیا کروگے دل خوش کب تک		ہولی کا قرار تھا، سو یہ بھی ہو لی
ایک ہیں آشنا مرے غم خوار	مثنوی	پوچ گو بیوقوف بد اطوار
ان کی تعریف کیا کروں میں بیاں		کہتی شرماتی ہے گی منہ میں زباں
دل ہے ان کا کہیں دماغ کہیں		گھر میں ڈھونڈو تو بھونے بھانگ نہیں
منہ کو ان کے خدا نہ دکھلاوے		گر کوئی دیکھے خاک کیا کھاوے
چار پیسے کا سیر بھر ٹھرّا		پی کے رکھتے ہیں جی میں یہ غرّا
آج دنیا میں ہیں جو کچھ ہم ہیں		مالکِ چار دانگ عالم ہیں
دیکھتا ہوں جو ان کی میں صورت		یاد آتی ہے چین کی مورت
گال جبڑے سے یوں رہے ہیں لپٹ		لگ رہے ہوں کواڑ کے جوں پٹ
تس پہ چیچک نے یوں ہے ماری میخ		جوں جڑی ہوں کواڑ میں گُل میخ

ہیں تو کرتا نہیں سخن چینی / ناک ہے جوں کواڑ کی بینی
آنکھ گر ہے تو گھر سے باہر ہے / حلقۂ چشم حلقۂ در سے ہے
کان ایسے پڑے ہیں دونوں طرف / جوں ڈفالی کا ہوئے پھوٹا دف
منہ ہے سنڈاس کی طرح بدبو / لوگ کرتے ہیں دیکھتے اخ تھو
ان کے دھارے کو دیکھ کر فی الحال / جن کے دیکھے نہ ہوویں کالے بال
دیکھ نقاش اس کی پیشانی / کھینچتا دل میں ہے پشیمانی
کھوپڑی سر سے ہے گی یوں اٹکی / جوں کہ چوٹھے پہ اوندھی ہو مٹکی
توند لٹکے ہے پیٹ سے ایسی / پیٹ تے ہووے پیٹ سے جیسی
صاف کہتا ہوں میں بہ مجبوری / ناف ہے جا ضرور کی موری
کیا کہوں اس کی اور بد حالی / منہ ہے چکنا تو پیٹ سے خالی

ولہ
دل لیکے زلف اس کی یوں حلقہ زن ہے مجھ پہ / بیٹھا چمن میں ہووے جوں سانپ من کے آگے

ولہ
بتاں اٹھاتے نہیں ہاتھ میرے کینہ سے / رہے ہے سنگ کتیں لاگ آبگینہ سے
ضرور کیا ہے کہ ہوتا ہے تو خجل ناصح / ہماری جیب کو ہے کیا لگاؤ پہنے سے
نہ اٹھ سکے گا مرے لب سے حرف بوسہ کا / مٹا سکے ہے کوئی نام کو نگینہ سے
ابیں ضعیف ہیں اتنا ہوا بقول فغاں / اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے

ولہ
کیا برا وقت تھا اس شوخ سے جب آنکھ لگی / جب تلک جیتے رہے روز نہ شب آنکھ لگی
بزم رنداں میں اسے دیکھ کے چھپ جاتے ہیں / کیا مگر شیخ کی ہے بنت عنب آنکھ لگی

ولہ
میں گذرا یار کے ملنے سے جاؤ جس کا جی چاہے / غرض اب عشق سے عاشق کہاؤ جس کا جی چاہے
حیاتِ جاوداں بخشے ہے تیغ آبدار اس کی / اگر باور نہ آوے جا کے کھاؤ جس کا جی چاہے

ولہ
یار بھی اب گلہ لگا کرنے / یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی
ہاتھ میں اپنا سر لئے رہنا / عشق کی پہلی یہ سلامی ہے

دل گرفتار کیوں نہ ہو میرا		بر میں جامہ ترے دو دامی ہے
زاہد کبھو تو گرد نہ پھریو شراب کے	ولہ	یہاں آگ ہے چھپی ہوئی پردے میں آب کے
کیا چشم منعماں سے رکھیں مفلسانِ دہر		دریا نے تو بھرے نہیں کاسے حباب کے
پھرتا ہے کیوں بھٹکتا اے شیخ ہر طرف تو	ولہ	کہتا ہے جس کو کعبہ وہ یار کی گلی ہے
کہا کرتے ہو مجھ کو قابل جور و جفا یہ ہے	ولہ	جو کوئی چاہے کسی کو اے میاں اُس کی سزا یہ ہے
برہمن دیر کو پوجے ہے اور کعبہ کے تئیں زاہد		پرستش ہم جسے کرتے ہیں، وہ نام خدا یہ ہے
رشک گلزار ہوا داغ سے سینہ میرا	ولہ	یار کے بھاویں تماشا ہے، تماشا یہ ہے
اس ماہ رو کے سامنے آتی ہے چاندنی	ولہ	اپنے تئیں اب آپ ہنساتی ہے چاندنی
مُنہ دیکھو تیرے سامنے آ کر سفید ہو		ماٹی میں آبرو کو ملاتی ہے چاندنی
دو دن کی چاندنی ہے پھر آخر اندھیری رات		ساقی پلا شراب کہ جاتی ہے چاندنی
کر آمد آمد اس مہِ تاباں کے تئیں ایس		کیوں چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی
غیروں سے اختلاط ہماری بلا کرے	ولہ	گر آشنا کرے تو تجھی سے خدا کرے
دنیا میں کہنے کو سب ہی کہلاتے ہیں بھلے		پر ہے وہی بھلا، جو کسی کا بھلا کرے

۱۵۔ افسوس

افسوس تخلص، میر شیر علی نام، والد ماجد ان کے سید مظفر علی خاں، داروغۂ توپ خانۂ نواب میر قاسم خاں عالیجاہ کے تھے۔ سلسلہ سیادت کا ان کی حضرت اسمٰعیل اعرج کو، کہ بڑے بیٹے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے تھے، پہنچتا ہے۔ وطن بزرگوں کا خاف ایک مکان ہے علاقہ میں عرب کے۔ بزرگوں نے ان کے ہندوستان میں آکے نارنول میں سکونت اختیار کی۔ اس سبب سے وطن ان کا نارنول مشہور ہے۔ میر مذکور کے باپ اور چچا کو، کہ سیّد مظفر علی خاں اور سید غلام علی خاں نام رکھتے تھے، نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم

کی رفاقت میں سررشتۂ ملازمت کا نہایت اقتدار، اور عزو وقار کے ساتھ توپ خانے کی داروغگی کے ساتھ سرفراز تھے، اور رسالہ معقول سے حضور میں مختار تھے۔ بعد شہید ہونے نواب عمدۃ الملک کے سید غلام علی خاں کو نیابت صوبہ الہ آباد کی بالذات بھی تھوڑے دنوں رہی آخر فالج بیماری سے انہوں نے سیر روضۂ رضوان کی کی۔ ان کی وفات کے بعد سید مظفر علی خاں خانہ نشین ہوئے، اور بارہ برس بے روزگار بیٹھے رہے۔ آخر نواب خان خانان عالم بقاء اللہ خاں مرحوم نے لکھنو میں انہیں بلوایا، اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مشاہرہ میں تین سو روپے کا واسطے ان کے درماہہ ٹھرایا۔ ان ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن گیارہ برس کا یا کچھ کم زیادہ ہے، لیکن مولد ان کا دار الخلافہ شاہ جہان آباد ہے۔ یہ بھی ہمراہ اپنے والد ماجد کے لکھنؤ میں آئے، اور طور بود و باش کا یہیں ٹھرائے۔ بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خاں کے، کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کے تھے، سید مظفر علی خاں وارد مرشد آباد ہوئے، اور داروغگی توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت و امداد ہوئے۔ آگے بیان ساتھ تفصیل کے بموجب طول کلام کا ہے۔ غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر معہ صوبہ دار بنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہیں، تو سید مظفر علی خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خاں کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انہوں نے نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ چلے آئے، اور بعد کئی برس کے حیدر آباد کی طرف گئے، وہیں وصال انکا ہوا۔ اس ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن اُنیس ۱۹ برس کا تھا شعر و سخن کے ساتھ موانست ان کو بہ شدت تھی، اور طبیعت کو مناسبت نہایت۔ چنانچہ صغر سن سے شعر کہتے ہیں، اور اکثر اس شغل میں رہتے ہیں۔ اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی، اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔ ابتدا میں یہ سررشتہ روزگار کا نواب سالار جنگ مرحوم کے ملازموں میں رکھتے تھے۔ اور میرزا نوازش علی خاں، جو نواب مذکور کے بڑے بیٹے ہیں،

گیارہ برس ان کے متعینہ رہے۔ بعد برہم ہونے اس سررشتہ کے، صاحب عالم و عالمیان میرزا جواں بخت جہاں دارشاہ کی عنایت اور قدردانی ازبسکہ حد سے زیادہ دیکھی، سعادت توسل کی انہوں نے ملازموں میں اس عالی بنا کے حاصل کی جس ایام میں اس نیر اوج شہریاری کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا، اور کوچ شاہ جہان آباد کو ہوا، تو میر مذکور بہ سبب بعضے بعضے عوارض کے رہ گئے، اور ساتھ نہ جا سکے۔ ایک مدت سے بتوکل و قناعت ہمراہی میں نواب سرفراز الدولہ بہادر کے دن زندگی کے بسر کر رہے تھے، کہ صاحبان والا مناقب عالی شان بارلو صاحب نے، مشورے سے عالی قدر سخن آفرین مسٹر گلگرسٹ صاحب، زبان دان ریختہ لکھنؤ سے طلب کیئے۔ بڑے صاحب نے لکھنؤ کے، کہ نامی اس معدن رافت کا ہر صاحب ہے، بہ عزت تمام ان کو بلوا کے، اور مشاہرہ دو سو روپے کا ٹھیرا کے، پانچ سو روپیا خرچ راہ دیا، اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ جب مرشد آباد میں یہ آئے، تو و فور محبت سے اسی دن غریب خانہ میں تشریف لائے، کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنؤ سے نکلا تھا، اور وارد مرشد آباد کا تھا، دیدار سے اپنے انہوں نے نہایت خوش و خرم کیا۔ اور چلتے ہوئے وعدا کلکتے کی سیر کا اس عاصی سے لیا۔ غرض بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بلدہ کلکتے میں، صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزت تمام رکھتے ہیں۔ اور گلستاں کے ترجمہ کا کمپنی کی سرکار سے کام رکھتے ہیں۔ راقم آثم سے ملاقات ایام شباب سے ہے۔ فی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانے کے انتخاب سے ہے عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکساری میں فرد کامل ہیں، منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات اور معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی یاد ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔ اقسام نظم ہیں +

کیوں نہ ہو گھمنڈ اس بت پر غرور کو — صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو
اس بت بے حجاب کا دیویں ابھی اٹھا نقاب — دیکھ سکے گا پر اسے تاب ہے اتنی طور کو
پانی نہیں فقط نہیں ڈوبی ہے سب کی زیب زیب — دیکھنا آج ہم نشیں آنسوؤں کے دفور کو
سچ ہیں یہ خود نمائیاں، حق ہیں یہ لن ترانیاں — شعلۂ طور بجھ گیا دیکھ کے اس کے نور کو

ناز بھرا وہ مُنہ، اگر دیکھے جو اک نظر تو بھر ۔۔۔ مُنہ پہ نہ لائے زاہدا بھولے سے ذکرِ حور کو

دو کسو نہ طعنہ زن مجھے ناکسوں کی خوشامدیں ۔۔۔ میں نے کبھی کی نہیں فقط، کرتے ہیں سب ضرور کو

تو نے افسوس کیا کیا، دشمنِ جاں کو دل دیا ۔۔۔ یہ تیری عقل جل بجھے، آگ لگے شعور کو

ولہ

سمند گرم جو یہاں اس سوار کا پہنچا ۔۔۔ غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا

تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بے چینی ۔۔۔ مگر پیام کسی بے قرار کا پہنچا

ملے ہے پانو سے اپنے وہ لالہ رو ہر دم ۔۔۔ یہ مرتبہ تو دلِ داغ دار کا پہنچا

ہے یہاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے ۔۔۔ لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا

قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس ۔۔۔ حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

ولہ

جب تلک عشق یارو، نہ دلِ ناکام تھا ۔۔۔ اپنے میں کیا چین تھا، اور دل کو کیا آرام تھا

بخشیو ہم کو تمہے ٹوکا ہے ہم نے بھول کر ۔۔۔ دردِ دل تیری بلا ہو، وہ ترا ہمنام تھا

ولہ

اس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی ۔۔۔ دیکھئے آگے آگے کیا ہوگا

ولہ

صبح نت کرتا ہے یہ دل اشکباری بیش تر ۔۔۔ ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیش تر

دل کے تئیں بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار ۔۔۔ بے وفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر

ولہ

ہنسکر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر ۔۔۔ روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر

غیروں سے تو ملے تو ملا کر، دلے مجھے ۔۔۔ کرنی نہیں کسی سے ملاقات تجھ بغیر

ولہ

بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں ۔۔۔ چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا مُنہ تکتے ہیں

ولہ

کہا میرا مطلق نہیں مانتا ہے ۔۔۔ تو جیسا ستاتا ہے جی جانتا ہے

ولہ

کوئی دل سے مرے پوچھے جیسا ہے وہ اے ناصح ۔۔۔ تجھ کو نہ خوش آیا یہ، پر مجھ کو تو بھاتا ہے

۱۶- آشفتہ

آشفتہ تخلص، حکیم رضا قلی خاں نام، والد ماجد ان کے حکیم محمد شفیع محمد خاں مرحوم تھے،

متوطن اکبر آباد کے۔ بڑے بھائی ان کے میرزا ہجو صاحب، خدا مغفرت کرے، ذرہ تخلص کرتے تھے عجب ولولے اور ذوق شوق کے ساتھ کربلائے معلّٰی گئے، اور وہیں خاک ہوئے، روبرو ضریح مقدس کے دفن ہیں۔ حق سبحانہ تعالےٰ حشر بھی ان کا، اور جمیع مومنین کا، جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ساتھ کرے۔ دوسرے بھائی ان کے، میرزا رضی صاحب، وہ بھی ان سے بڑے ہیں، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جو جو اختراعات فن طبابت میں انہوں نے کئے، دیکھنے کا کیا دخل ہے، کسی نے نہیں سنے۔ حذاقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی۔ ہمیشہ بزرگ ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا نازد اعزاز کیا کئے ہیں۔ غرض حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے ہیں۔ جوان آزاد وضع، اور خوش اختلاط وارستہ مزاج، اور مایۂ ارتباط میں محبت، اور یکرنگی میں خلاصے، اور آشنائیوں کے بہت خاصے حسن پرستی میں خود لیلی و شیریں کی تصویر، اور عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر، ہیں۔ مشورا سخن کا انہوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے۔ میر صاحب مذکور کے طرز ادائیہ میں انہوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے۔ چندے انہوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی، جو کہ پوتے میرزا یوسف کور کے تھے، اس سبب سے دو اڑھائی برس بود وباش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی، وگرنہ پرورش انہوں نے لکھنؤ میں پائی ہے، اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے۔ ۱۲۰۸ھ بارہ سو آٹھ ہجری میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے، اگرچہ معالجہ میں انہوں نے رنگ مسیحائی کے دکھلائے، لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے، خلف الصدق سے ان کے، یعنی نواب عضد دولہ ناصر الملک سید بابر علی خاں بہادر دلیر جنگ سے، نہایت موافقت آئی، اور صحبت نے بہ شدت یک رنگی پائی۔ چناں چہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے،

اور قریب لاکھ روپے کے بنگالہ میں پیدا کئے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روزگار تھے، کہ جس دن مرشدآباد سے نکلے تو قرض دار تھے۔ غرہ ذی حجہ کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں اپنے ہی مزاج نازک سے، ناحق روزگار چھوڑ کلکتے میں چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں، اور اک رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں۔ طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے۔ اپنی آشفتہ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، وگرنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں +

جی تھا آنکھوں میں یار تھا دل میں	یہاں تلک انتظار تھا دل میں	
آبلہ ہو کے دم میں پھوٹ بہا	یہ کہاں کا بخار تھا دل میں	
مر گئے پر بھی ہم کو خاک نہ دی	آج تک یہ غبار تھا دل میں	
کھینچتے ہی ٹک اے کمان ابرو	تیر مژگاں دو سار تھا دل میں	
دم آخر جو ہچکی آتی تھی	وہ فراموش گار تھا دل میں	
دست و لب نزع میں جو ہلتے تھے	شوق بوس و کنار تھا دل میں	
دم شماری تلک بھی آشفتہ	قدموں کا شمار تھا دل میں	
فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ	ادھر ادھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ	ولہ
نہ پیچ و تاب کو بالوں کے طول دو اتنا	ہمارا دل ہے پریشان، دیکھتے جاؤ	
بجائے اشک نکلتے ہیں پارہائے جگر	تمہارے ہجر میں تھا ارمان، دیکھتے جاؤ	
دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی خوبی	ہمارا چاک گریبان، دیکھتے جاؤ	
کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف	جناب عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ	
اگرچہ ہو ویں گی تصدیع لیکن آشفتہ	کوئی گھڑی کا مہمان، دیکھتے جاؤ	

وصل اس کا خدا قریب کرے / ولہ / دیکھیں، تب ہم سے کیا رقیب کرے

ہجر ہے قتل، وصل سے احیاء / حب میں جو آوے، سو حبیب کرے

گل کا دیکھا چٹک کے چپ ہونا / شور کیوں کر نہ عندلیب کرے

مرگیا ایک صنم پہ آشفتہ / موت ایسی خدا نصیب کرے!

یہ خرابی تو پڑی مجھ پہ ترے جانے سے / ولہ / جغد بھی ڈرنے لگے اب مرے ویرانے سے

کس طرح قید کروں، یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں / کون بر آوے بھلا، اس دل دیوانے سے؟

میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے / فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے

شعلہ خو! آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے / آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے

دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ اوسان گئے / اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے

اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر / ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے، ترے قربان گئے

مجھ کو کہتا ہے صنم، تجھ کو بھی اب بھاگ لگے / ولہ / آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے، تجھے آگ لگے

بوسہ کے واسطے چمٹا، تو لگا کہنے مجھے / بس کہیں دور بھی ہو، مُنہ کو ترے آگ لگے

باب البا

۱- بیدل

بیدل تخلص، میرزا عبدالقادر نام، قوم چغتا، لیکن نشو و نما انہوں نے ہندوستان میں پائی ہے، جودتِ ذہنِ سلیم، اور ذکائے طبعِ مستقیم، کے باعث تصویر نازک خیالی کی بہت نکہ سکھ کی کھینچ کر باریک بینوں کو دکھائی ہے۔ بیشتر اختراعات انہوں نے زبان فارسی میں کئے ہیں، لیکن اہلِ محاورہ کے مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ آسماں جاہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ توسل رکھتے تھے، اور مورد الطاف و عنایت شاہزادۂ عالم و عالمیان کے رہتے تھے۔ قوت جسمانی اور طاقت بدنی قادر قوی نے اتنی انہیں عنایت فرمائی تھی، کہ اوروں کے معاصرین کے حصہ میں کم آئی تھی

چناں چہ اک روز رکاب میں شاہزادے کی عین سواری کے دوا دوش میں ایک شیر نکل آیا، اور کئی بیچاروں اجل کے ماروں کو ذائقہ مرگ کا اس نے چکھایا۔ آخر میرزائے مذکور کے ہاتھ سے بکری کی طرح مارا گیا، اور اپنی جان سے بیچارہ گیا۔ دفعتاً ایسے ردی خلائق سے یہ بیزار ہوئے، کہ روزگار پاکشیدہ، اور دنیاداری سے دست بردار ہوئے۔ طریقہ فقر اور گوشہ نشینی کا اختیار کیا، دل کو فراغ یاس اور خون تمنا سے رشک گلزار کیا، لیکن دروازہ ان کا کثرت اعتقاد سے مسجود خاص و عام تھا، اور بوسہ گاہ امیران عظام تھا۔ نواب نظام الملک صوبہ دار دکھن کا خط مکرر اور متواتر اس مرکز دائرۂ قناعت کی تحریک میں آیا، لیکن قطب آسمان توکل نے حرکت کو قبول نہ فرمایا۔ ایک بیت فارسی نظام الملک کے جواب خط میں لکھی ہے، اس سے قناعت اور جواں مردی اس شیر بیشۂ استغنا کی معلوم ہوتی ہے۔

اس بیت کو بہ سبب زبان فارسی کے حاشیہ[1] پر لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا اس طرح داخل کتاب کیا ہے۔

کب عوض دنیا کے سرکوں، جا کے چھوڑوں ٹھاون کو   باندھی ہے مہندی قناعت کی میں اپنے پانو کو

کلیات ان کا از روئے نظم و نثر کے قریب لاکھ بیت کے مشہور ہے، لیکن اہل دنیا کی تعریف کہیں ایک مصرع میں نہیں مذکور ہے۔ بحر متدارک اور کامل وغیرہ پانچوں وزن، جن کے ناظم مخصوص شعرائے عرب ہیں، اور عجم ان سے احتیاط کرتے سب کے سب ہیں، اکثر میرزا نے غزل ان اوزان میں کہی ہے، اور داد نازک خیالی کی دی ہے۔ از بس کہ مدار دنیائے دو روزہ کا فنا پر ہے، ۱۱۳۳ھ گیارہ سو تینتیس ہجری میں بلدہ شاہ جہان آباد کے اندر اس سرائے فانی سے عالم باقی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان دو بیتوں نے، زبان ریختہ میں اس قادر سخن کے نام سے شہرت ہے پائی۔

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے، ہم ہیں	اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے، ہم ہیں
[1] دنیا اگر دہند، نہ جنبم زجائے خویش	من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا / پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے، ہم ہیں

۲۔ بیان

بیان تخلص، احسن اللہ خاں نام، شاگردوں میں سے میرزا مظہر جان جاناں کے تھا۔ سکونت دلی میں اختیار کی لیکن متوطن اکبر آباد کا تھا۔ شاگردوں میں سے میرزائے مذکور کے عاشق مزاج اور شیریں زبان تھا۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان تھا۔ یہ اشعار منتخب دیوان اس سخنور خوش بیان کے ہیں ٭

وہ بھی کیا دن تھا کہ ہم آغوش ہم سے یار تھا / در کے باہر مدعی جوں صورتِ دیوار تھا

اس تجاہل پر پڑا میں یہ سمجھتا ہوں گور میں / وہ کہ جن کی چشم کا میں عمر بھر بیمار تھا

دیکھ کر تابوت کو، بیمارداروں سے مرے / پوچھنے لاگا کہ اس مردے کو کیا آزار تھا

وله

کوئی کسی کا بیان، آشنا نہیں دیکھا / سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا کہیں دیکھا

وله

آگر جوں ہی قاصد نے لیا نام کسی کا / اس نام کے سنتے ہی ہوا کام کسی کا

کیوں آج سماتا نہیں اپنے میں خوشی سے / کیا تجھ کو بیاں پہنچا ہے پیغام کسی کا

وله

عالم کو تاج و گوہر و تخت دلوا دیا / اے آسمان بنا تو، مجھے تو نے کیا دیا

نے دین سے اطلاع ہے، نہ دنیا کی کچھ خبر / اس عشق نے غرض ہمیں سب کچھ بھلا دیا

ایسے ہی میرے بخت جو ماتے تھے نیند کے / خوابِ عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا

وله

کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب سے آشنا / ایک بیگانہ ہے مجھ سے، اور سب سے آشنا

غیر کے کہنے پہ مت بیگانہ ہو یکبارگی / دیکھ تو اے شوخ! میں تیرا ہوں کب سے آشنا

وله

ہم دم نہ فکر کر، کہ مرا کام ہو چکا / گر دل مرا یہی ہے، تو آرام ہو چکا

آتا ہے تجھ کو ننگ، مرے نام سے عبث / اے شوخ! اب تو شہر میں بدنام ہو چکا

وله

اگر اک صبح دم آتا وہ اٹھ کر خواب شیریں سے / ہمارا کیا گریباں، ناصحوں کا پیرہن پھٹتا

جگایا مجھ کو کس کم بخت نے ہائے!	ولہ	مری آنکھوں کے آگے وہ ابھی تھا
تو تو ساقی جام ترسا کر پلاتا تھا مجھے	ولہ	یار کی آنکھوں نے مجھ کو کر دیا یکبار مست
روکر اس سے میں کہا، مرتا ہے یہ بیمار آج	ولہ	مسکرا کر وہ لگا کہنے، کہ اس کا کیا علاج
یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ	ولہ	بلا سے پھاڑ کے پھر ہاتھ میں ملے کاغذ
وہ کون دن ہے کہ غیروں کو خط نہیں لکھتا		قلم کے بن کو لگے آگ ! اور جلے کاغذ
عرش تک جاتی تھی، اب لب تک بھی آ سکتی نہیں	ولہ	رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر
اک بار فوج عشق پڑے مجھ پہ ٹوٹ کر۔	ولہ	لے کے قرار و دین و دل و ہوش لوٹ کر
لینا اگر ہے دل کو، تو لے بھی اسے کہیں		سینہ میں اب تلک تو رکھا مار کوٹ کر
ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی، کہ مثلِ خار		پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر
کیا ایسے سے دردِ دل کو کہئے	ولہ	ادھر تو سُنا، اُدھر فراموش
میں بس کہ خاک میں ترے کوچے کی مل گیا	ولہ	تس پر بھی تیرے دل میں ہے مجھ سے غبار حیف
تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی	ولہ	مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو، تو کافر ہوں
کافر ہو، جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو	ولہ	اک مختصر سی جا ہو، میں ہوں، اور تو ہو
مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی	ولہ	جس طرح کٹا روز، گذر جائے گی شب بھی
آخر تو شکایت سے مجھے منع کرے ہے		سی دیجیو ٹک ہاتھ سے اپنے مرے لب بھی
جہاں رووں تمنا میں تری اے شمع رو پیارے		اوگے اس گل زمیں سے حشر تک جوں لالہ انگارے
قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے	ولہ	اُسے کہتے ہیں عاشق، جو کوئی یہاں نقد جاں ہارے
آنسوؤں تک پوچھنے کی غیر کے تدبیر ہے	ولہ	مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا، کہ کیوں دل گیر ہے
چرخ کی برہم زنی سے یہ تعجب ہے بیاں		لیلی و مجنوں کی یک جا اب تلک تصویر ہے
شب فراق کی وحشت سے جان جاتی ہے	ولہ	یہی ہے صبح سے دھڑکا، کہ رات آتی ہے
جا کہو کوئے یار میں کوئی۔	ولہ	مر گیا انتظار میں کوئی

وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا — سر رکھے اس کنار میں کوئی

ولہ
جادو تھا، کہ سحر تھی، بلا تھی، — ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
کیدھر ہے، کہاں ہے، اخوشدلی تو — ہم سے کبھو تو آشنا تھی

ولہ
رسوا ابھی سے کرتی ہوائے چشمِ تر مجھے — آتا ہے اس کی بزم میں بارِ دگر مجھے
آیا ہوں اس گلی سے ابھی، دم نہیں لیا — پھرنے چلا ہے یہ دلِ وحشی اُدھر مجھے
کُنجِ قفس سوا مری قسمت میں جا نہ تھی — تو کیوں دیئے فلک نے میاں بال و پر مجھے

ولہ
جھگڑتے تجھ سے پیارے حجاب آتا ہے — وگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہے
پیو شراب جوانو! کہ موسمِ گل ہے — ہمیں بھی یاد وہ عہدِ شباب آتا ہے

اپنے دل سے بھی عداوت ہو گئی ہے اب مجھے — دشمنِ جانی ہی میرا، جو کوئی چاہے مجھے

کوئی مجنوں قیس نہ دیوانہ ہوا لیلیٰ کا — میں ترے عہد میں دیکھوں ہوں جدھر مجنوں ہے

ولہ
کیا زلف میں اُس شوخ کے تھی دیکھی صبح — یا شام سے پھولی تھی کسی شب کی صبح
ٹک زلف کو میں ہاتھ لگایا، کہ ادھر — ہمسایہ پکارا، کہ ہوئی کب کی صبح

رباعی
جس وقت کہ بیدار وہ ہوتا ہیں گا — عالم کی غضب سے جان کھوتا ہیں گا
غنچوں کو صبا کہیو، کہ آہستہ کھلیں — زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہیں گا

رباعی
مت کہیو بیاں جامِ اجل پیتا ہے — یا اُس کے لئے کوئی کفن سیتا ہے
یارو جو مرے حال کو پوچھے وہ شوخ — اتنا کہیو، کہ اب تلک جیتا ہے

رباعی
سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہے مجھے — ہر چیز میں یک جلوہ دکھاتا ہے مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہے یارب! — ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہے مجھے

رباعی
کہتا ہوں جنابِ حق میں ڈرتے ڈرتے — مدت گذری دعا ہی کرتے کرتے
ہے اُس کو یہ قدرت کہ بیاں سا محروم — منہ یار کا دیکھ لیوے، مرتے مرتے

۳۔ بقا

بقا تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا، شاگردوں میں سے میرزا فاخر مکین تخلص کے بقا فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج، و باریک بیں، و معنی بند، و سخن آفریں تھا میرزا رفیع سودا تخلص کے منہ اکثر چڑھا، اور اس نہنگ بحر معانی کے ہجو میں کچھ کچھ واہیات مکر ربکا، لیکن میرزائے مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی، اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے، سو تیری ہجو نہ کروں گا، کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی، اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آ کر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب کے شروع کئے تھے، خیال میں اس سودائے خام کے مجنون ہوئے، اور جیتک جئے سودائی رہے سنہ ۱۲۰۶ بارہ سو چھ ہجری تھی، کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی، کہ تحصیل دولتِ حقبیٰ کی کیجئے، اور خاک راہ سے کربلاء معلا اور نجف اشرف کے دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجئے۔ یہ عزم کر کے جہاز پر سوار ہوئے، اور منزل مقصود کی طرف قدم گذار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دار فنا سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔ خوشا یہ حال کہ انجام تو بہ خیر ہوا +

یہ چند شعر اس راہ رو جادۂ بقا کے گوشۂ خاطر میں تھے، سو لکھے جاتے ہیں +

یاد میں تڑپے ہے دل اس ابروے خمدار کی		آج کچھ ناخن بدل ہے آہ! اس بیمار کی
دیکھئے، ہیں منصب مجنوں پہ یہ لیلیٰ صفتاں	وله	خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرفراز کریں
کیا خط لکھیں اُس کو حرکت ہاتھ سے گم ہے	وله	خامہ مرے اب ہاتھ میں انگشت ششم ہے
کس نے چمن میں رنجہ کیا عندلیب کو	وله	غنچے رہے ہیں دانتوں میں داب اپنی جیب کو
اس لب سے کچھ نہ چوسے قدح، اور قدح سے ہم	وله	تو کیوں ٹلے سبو سے قدح، اور قدح سے ہم
پاتے ہیں میکدے میں بقا روزِ فیض سے		خم سے سبو، سبو سے قدح، اور قدح سے ہم

۴- بیدار

بیدار تخلص میر محمدی نام، شاہ جہان آبادی، دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے۔ نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا، اور زباندانان دلّی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں کہتے ہیں کہ کلام اپنا انھوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے۔ اور اُس نقادِ بازارِ معانی سے فایدہ بہت سا اُٹھایا ہے۔ زبان ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں ◆

تو نے جو مدّتوں میں ادھر کو گذر کیا — نالے نے آج کچھ تو ہمارے اثر کیا
غیرت نہ آوے تجھ کو ستمگر ہزار حیف — جس دل میں تو مقیم تھا واں غم نے گھر کیا
ہم غافلوں کی آہ نہ اودھر نظر گئی — اُس نے ہزار اپنے تئیں جلوہ گر کیا
اس کھیل سے کہ اپنی مژہ کو کہ بار آئے — عالم کو نیزہ بازی سے زیر و زبر کیا
دیوانے کو پری سے پھر اب کر دیا دو چار — اے آنکھوں کیا کیا مرے جی کا ضرر کیا
کیدھر ہے تو کہاں ہے اجابت کہ بارہا — میں نے بلند دست دعا ہر سحر کیا
بیدار ایسے رونے سے امان بار آ — داماں و آستیں کو تو لوہو سے تر کیا

وله

آنکھوں میں چھا رہا ہے ازبسکہ نور تیرا — ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا
بیدار وہ تو ہر دم سو سو کرے ہے جلوہ — اُس کو جو تو نہ دیکھے ہیگا قصور تیرا

وله

جب کہا میں نے کہ اے سروِ ریاضِ خوبی — کس کا تو آفتِ جاں ہے تو کہا تجھ کو کیا
کہنے لاگا دلِ گم گشتہ ہے تیرا مجھ پاس — جب کہا میں نے کہاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

وله

یہ کون پئے شکار نکلا — ہر دل ہوا اُمیدوار نکلا
جینے کی نہیں ہے آس مجھ کو — تیر اُس کا جگر کے پار نکلا
ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک — دل سے نہ ترے غبار نکلا

جب بام پہ بے نقاب ہوکر		وہ صبح کو ایک بار نکلا
اُس روز مقابل اُس کے خورشید		نکلا بھی تو شرمسار نکلا
نالہ ہر چند ہم نے کر دیکھا	ولہ	آہ اب تک نہ کچھ اثر دیکھا
آج کیا جی میں آگیا تیرے		مُتبسم ہو جو ادھر دیکھا
بہے بیدار کی آنکھوں سے ساقی اشک سُرخ ایسے	ولہ	مے گلگوں کا کوچہ میں گویا تیرے سبو ٹوٹا
سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہوا	ولہ	حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہوا
آج آتا ہے نظروں مری آنکھوں میں سیاہ		رات اس زلف میں دل کس کا گرفتار ہوا
کھینچ کر زلف کی تصویر کو خط میں بھیجوں	ولہ	تا کہ معلوم کرے حالِ پریشان مرا
اے شانہ کھولیو گرہ زلف سوچ کر	ولہ	دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا
ہم چشمِ ابرِ دیدۂ تر گرچہ ہو سکا	ولہ	لیکن غبارِ غم مرے دل سے نہ دھو سکا
جو اب کے چھوڑے مجھے غم تری جدائی کا	ولہ	تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا
اُگے ہے پنجۂ مرجاں مزار سے اُس کے		شہید ہو جو کوئی اس کفِ حنائی کا
مرے قدم سے ہے سرسبز بوستانِ جنوں		ہر ایک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا
کہو تو کس سے میں پوچھوں نشانِ خانۂ دوست	ولہ	کہ آشیانۂ عنقا ہے آستانۂ دوست
حال سُن سُن کے ہنس دیا میرا	ولہ	کچھ تو آیا ہے مہربانی پر
آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا	ولہ	سرخ مے کالی گھٹا اور سبزی مینا کا رنگ
اس سے دو چار ہو گئے ہم	ولہ	سو جی سے نثار ہو گئے ہم
فتراک میں باندھ خواہ مت باندھ		اب تیرے شکار ہو گئے ہم
آ تیری گلی میں مر گئے ہم	ولہ	جی تھا سو نثار ہو گئے ہم
خاکِ عاشق ہے جو ہوتی ہے نثارِ دامن	ولہ	اے مری جان تو مت جھاڑ غبارِ دامن
خلشِ خارِ رہِ عشق سے اب اے ناصح		نہ رہا ایک بھی ثابت مرا تارِ دامن

ہم ترے اس دلِ نازک سے خطر کرتے ہیں	وله	ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
شبِ ہجراں میں نہ پوچھو کہ میں کیا کرتا ہوں	وله	صبح تک شمع کی مانند جلا کرتا ہوں
صورت اس کی سما گئی دل میں	وله	آہ کیا آن بھا گئی دل میں
تم کو کہتے ہیں کہ عاشق کا فغاں سنتے ہیں	وله	یہ تو کہتے ہیں کہ باتیں ہیں کہاں سنتے ہیں
اُٹھ گیا ہم سے گو مکدر ہو	وله	خوش رہے وہ جہاں ہو جیدھر ہو
اس سے بیدار بات تو معلوم		دیکھنا بھی کہیں میسر ہو
تعجب ہے کیا ناتوانی سے میری	وله	کہ فصاد شرمندۂ نیشتر ہو
دل کو کرتا ہے نگاہوں میں شکار	وله	واہ وا ہے تری صیادی کو
دیکھ آکر مری آنکھوں کی بہار		کر دیا باغ ہر اک وادی کو
تری مجلس میں اگر ہو گذر پروانہ	وله	نہ پڑے شمع پہ ہرگز نظر پروانہ
ہے زمانہ سے جدا روز و شبِ سوختگاں		شام کہتے ہیں جسے ہے سحر پروانہ
بوسۂ شمع کو جلنے کے بہانے آیا		دیکھو اے بزم نشیناں ہنر پروانہ
قید سے شمع کی ممکن نہیں چھوٹے بیدار		رشتۂ شمع سے باندھا ہے پر پروانہ
دیکھ تجھ کاکلِ مشکیں کی ادائیں شانہ	وله	دونوں ہاتھوں سیتی لیتا ہی بلائیں شانہ
اُس کے بھر آئے ترے مرہم کاکل سے زخم		ہاتھ اُٹھا کیوں نہ کرے تجھ کو دعائیں شانہ
ایک دن گر نہ ملی تجھ سے تو آشفتہ ہو		دیکھ لے کاکلِ مشکیں کی وفائیں شانہ
تھم گیا اشک شبِ ہجر میں روتے روتے	وله	سحرِ وصل کو مدت ہوئی ہوتے ہوتے
مردمِ چشم سے پوچھ اے مہ تاباں تجھ بن		کون سی شب کہ نہ گذری مجھے روتے روتے
کیوں کر عاشق سے بھلا کوچۂ جاناں چھوٹے	وله	بلبل زار سے کیوں کر کہ گلستاں چھوٹے
کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہہ تو		جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے
عاشق کا اگر دیدۂ خونبار نہ ہووے	وله	تو رشکِ چمن کوچۂ دلدار نہ ہووے

بخشی ہے جسے تجھ نگہ چشم نے مستی | وہ مست قیامت کو بھی ہشیار نہ ہووے
بیجا ہے شکایت ستم یار کی بیدار | ممکن ہے کہ معشوق دل آزار نہ ہووے

وله
نہ وفا ہے نہ مہر و اُلفت ہے | اے ستمگر یہ کیا قیامت ہے
گلِ صد برگ دیکھو اس کے ہاتھ | دلِ صد چاک کی کنایت ہے

وله
جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہو گئے | شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے

وله
کہاں ہے تو کہ میں کھینچوں ہوں راہ میں تیری | برنگِ نقشِ قدم انتظار آنکھوں سے

وله
ابتک مرے احوال سے وہاں بیخبری ہے | اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

وله
فولاد دلاں چھوڑیو زنہار نہ مجھ کو | چھاتی مری جوں سنگ شراروں سے بھری ہے
کس باغ سے آتی ہے بتا مجھ کو کہ یہ آج | کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیمِ سحری ہے

وله
لبِ رنگیں ہیں ترے رشکِ عقیقِ یمنی | زیب دیتی ہے تجھے نامِ خدا کم سخنی
ہار پہرے تھے جو پھولوں کے نشاں ہیں ابتک | ختم ہے گلبدنوں میں تری نازک بدنی

وله
نشہ میں جی چاہتا ہے بوسہ بازی کیجئے | اتنی رخصت دیجئے بندہ نوازی کیجئے

وله
زاہد اس راہ نہ آمست ہیں میخوار کئی | ابھی یہاں چھین لئے جبّہ و دستار کئی
کف پا ہیں ترے صحرا کی نشانی بیدار | مرگیا تو بھی پھپھولوں میں رہے خار کئی

وله
میر مجلس رنداں آج وہ شرابی ہے | خون دل جس سے مرا بادۂ گلابی ہے
ترے اے پری پیکر سینہ پر نہیں پستاں | طاق حسن پہ گویا شیشۂ حبابی ہے

وله
دوستو جانے دو اب ہاتھ اُٹھاؤ ہم سے | یہ ہے وہ زخم کہ بہ ہو نہ کسی مرہم سے
مہرباں خیر تو ہے کس پہ یہ غصہ کیجے | آج آتے ہو نظر کچھ تو مجھے برہم سے

وله
جو کچھ چاہئے آپ فرمائیے | پہ غیروں کی باتیں نہ سنوائیے
ڈراتے ہو کیا قتل کرنے سے ہم کو | اگر یوں ہی جی میں ہے آجائیے

رباعی
بیدار رواں ہے اشک دریا دریا | بتلا تو کہ ہے دیدۂ تر دریا دریا

رعونت سے ترے تمام خانہ ہے خراب | حیراں ہوں میں اس میں ہے گھر یا دیا

۵۔ بسمل

بسمل تخلص، سید جبار علی نام، متوطن جبار کھڑکی۔ چند مدت انہوں نے عظیم آباد میں گذر کئے ہیں، اور تھوڑے سے دن مہاراجہ جیت سنگھ، بنارس کے راجہ، کی وکالت میں اوقات بسر کی ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ گیارہ سو چھیانوے ہجری میں میر مذکور سے بلدۂ محمد آباد و بنارس میں مکرر اتفاق ملاقات کا ہوا ہے۔ جوان سلیم الطبع اور سخن فہم نظر پڑا، آزادوضع اور وارستہ مزاج دکھائی دیا۔ یہ اشعار اس کے خلاصۂ افکار ہیں۔

نالۂ درد و الم میں نے جب آغاز کیا
جو ترے غم کے سوا تھا قلم انداز کیا

ولہ
اتنا ہی داغ عشق سے معمور ہو گیا
سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا

ولہ
یار تیری ہی زلف میں دیکھا
ایک زنجیر لاکھ دیوانہ

ولہ
کیا خیال آوے بلاؤں سے اسے پرہیز کا
ہے جو بیمار اس تری چشم بلا انگیز کا
آگ ہر ساعت برستی ہے نہ تنہا چشم سے
ہے تماشا استخوانوں میں مری گلریز کا

ولہ
جب غمزۂ چشم یار دیکھا
سو تیر جگر کے پار دیکھا
یاد آ گئی مشتِ خاک اپنی
اڑتے جو کہیں غبار دیکھا

ولہ
دل خس و خاشاک کی صورت اٹکتا ہی رہا
گو سدا دامن کو اپنے وہ جھٹکتا ہی رہا
جستجو میں یار کی گم کردہ راہوں کی طرح
میں کبھی ادھر کبھی ادھر بھٹکتا ہی رہا

ولہ
خط ترا نامِ خدا خط ہے ادا و ناز کا
دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے اس آغاز کا

ولہ
کیا اس کو جتا دیں ہم جو ہم نے کیا ہوگا
کیا کیا نہ کیا ہوگا جب دل کو دیا ہوگا

ولہ
دل میں برنگِ موج تمہارے وصال کا
بڑھ بڑھ کے اشتیاق کئی بار گھٹ گیا

ولہ
ہر دم مجھے نیاز اسے ناز ہی رہا
انجام کارِ عشق کا آغاز ہی رہا

صیاد فائدہ ہے رہائی سے کیا مجھے — اُڑنے سے جب مرا پر پرواز ہی رہا

وله — سدا نکلا ہی کرتا ہے پگھل کر آتش غم سے — سرشک آنکھوں سے میری روغن بادام کی صورت

خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی کو غیر بسمل کے — تمہارے خنجر مژگان خون آشام کی صورت

وله — تیر نگاہ بسکہ لگی چھوٹ چھوٹ کر — چھاتی مشبکہ وار ہوئی پھوٹ پھوٹ کر

یہ داغ عشق مثل بنے نے نواز کے — نکلے ہے بند بند سے اب پھوٹ پھوٹ کر

وله — پہلو میں رکھوں ہیں دل ناشاد کہاں تک — اے درد کروں نالہ و فریاد کہاں تک

در آج قفس کا ہے کھلا کیجیئے پرواز — اے ہم قفساں خاطر صیاد کہاں تک

وله — زمانے سے نرالے ہیں جگر افگار کہتا ہوں — کہ لوگ ابرو جسے کہتے ہیں میں تروار کہتا ہوں

وله — جز یاد حق نہ ہو ترے دل میں کبھو گرہ — دے سبحہ وار منہ پہ اگر اپنے تو گرہ

ہر دم نمو و قبضۂ شمشیر کی طرح — رہتی ہے ابروؤں میں ترے تند خو گرہ

وله — دل کی طلب ہے اور تمنا ہے جان کی — کیا مہربانیاں ہیں مرے مہربان کی

درد و الم سے منزلت دل ہے بس بلند — یعنی مکیں سے ہے گی بزرگی مکان کی

وله — لے خانہ اس غلام ارشاد کیجیے — گو کام کا نہ ہووے تو آزاد کیجیے

کوے بتاں تلک تو رسائی محال ہے — جب تک یہ مشت خاک نہ برباد کیجیے

وله — پیارے یہ وضع چشم مروت سے دور ہے — دل لے کے اس طرح بھی نہ آنکھیں چرائیے

وله — رو برو تیرے ہی گر ظالم نہ یہ دل کیجیے — پھر اس آئینہ کو جا کس کے مقابل کیجیے

وله — اُٹھتا ہے وہ غبار ہمارے مزار سے — ٹک لیا کرے ہے جونت کو ہمارے سے

آوارگی سے باز رکھوں آہ کس طرح — دل تو گزر چکا ہے مرے اختیار سے

وله — گریہ افزا اس قدر اعضا مرے سارے ہوئے — ہر بن مو جوش سے آنسو کے فوارے ہوئے

وله — پیش آئی ہمارے وہ جو کچھ کہ تھی پیش آنی — اب یہ در دولت ہے اور اپنی یہ پیشانی

وله — عشق کی بازی میں بس جل دل جلے درکار ہے — کس لئے تو اس قدر بیٹھا ہی جی ہارے ہوئے

تیری ہی یاد و ذکر ہی تیرا ہر آن ہے	ولہ	گویا کہ اس لئے مرے مُنہ میں زبان ہے	
عہد و پیمان بتاں بسکہ بے سالوسی ہے	ولہ	ایک اُمید تو سو باعثِ مایوسی ہے	
داغ اتنے ہی دیئے عشق نے تیرا کے تمام		مو بہ مو تن پہ مرے جلوۂ طاؤسی ہے	
آئیے جلد کہ یہ بسمل مجروح ہنوز		ہر لب زخم سے مشتاقِ قدم بوسی ہے	
دُکھ درد کو کب تلک حکایت کیجے	رباعی	دوراں کی کہاں تلک شکایت کیجے	
اس کشور دل پہ فوج غم کا ہے ہجوم		یا شاہِ نجف میری حمایت کیجے	

بابُ التّاء

۱۔ تاناشاہ

نام نامی اور اسمِ گرامی اس بادشاہ عشرت دوست کا ابوالحسن تاناشاہ ہے۔ سلاطینِ نامدار اور خواقین عالی مقدار دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرا عیش و نشاط کا اور آوازہ مسرت و انبساط کا اس عیش مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے، لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سر آرائے بارگاہ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے جس ایام میں کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا، اور صوبہ دکھن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا تو ابوالحسن تاناشاہ بھی نظربندی میں آئے، اور فلکِ نیرنگ باز نے بدلے اس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھا سامانِ عیش سب برہم ہوا، اور مجمع اسبابِ نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی ان کے اوقات میں چاہی، انہوں نے قبول کیا، لیکن حُقّہ کے مقدمہ میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہے۔" ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حُقّہ ایک دم مُنہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشہ سے گلاب کے حُقّہ تازہ

ہووے، پھر ایک شیشہ میں بید مشک کے حقہ بردار نیچے کو بھگووے، شغل میں عیش و نشاط کے ازبسکہ دن کو کم سوتے تھے، سیکڑوں شیشہ گلاب خالص اور عرق بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس عجز سے کہلا بھیجا۔ بارہ سولہ شیشہ گلاب کے اور آٹھ شیشہ بید مشک کے حکم فرمائے۔ سبحان اللہ! یا تو حقہ آٹھ پہر منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور اُن کے دودِ محفل کے رشک سے دھواں حسد کا حقہ سرِ آسمان میں گھٹتا تھا، یا پیچ سے فلکِ حقہ بازی کی آٹھ چلمیں دن رات میں پیتے تھے، اور گھونٹ گھونٹ کر عجب پیچ و تاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشہ گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقہ کے مصرف میں آنے اسراف سے، اور امورات شرعی میں پاسِ خاطر بیجا بیجا، اور تکلفِ رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشہ ہر روز یہاں سے جایا کریں ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کر کے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں"۔ جب حضور سے ہر روز آٹھ شیشہ آنے لگے، تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے۔ یہ ماجرا اُن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انہوں نے اپنے حقہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے، تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انہوں نے عرض کیا۔ جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز اسی خرچ کے ساتھ سالہا سال پلا سکتا ہے، اُمید ہے کہ بھیڑی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلال کا زمین میں سرخروئی کے بووے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گڑا سُن کر، نہایت آسان ہے، تو جو ہمارے مصرفِ بیجا کا کفیل ہوتا ہے ابھی ایک دم میں جمع پونجی سر پہ ہاتھ دھر کے روتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقہ نہ پیا، جبتک کہ ان کی نظربندی میں رہے، اور اس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے سبحان اللہ! چشم حقیقت بین سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ زحمت۔

کدھر ہیں خسرو جم لطف کیقباد کدھر　　کہاں سکندر و دارا کہاں ہے کیکاؤس
جو مست جاہ ہیں دیکھیں وہ چشم عبرت سے　　کچھ ان کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس

اگرچہ ملک گیری اور کشور ستانی کے معاملہ کو سمجھنا شاہان عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے، لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد[1] کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے۔ تحصیل حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا، اور بادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہاتا تھا۔ مآل اس مشقت کا اعجوبہ نظر آیا، کہ اس حسن تردد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھایا۔

واقف رموز ملک سے ہیں شاہ و شہریار　　ہے تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول[2]

غرض شاہ عالیجاہ ابو الحسن تانا شاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں، اور باعتبار محاورۂ دکن کے، اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے:

کس وں سکھوں، جاؤں کہاں، مجھ دل پہ بھل بھراٹ ہے　　اک بات کے ہونگے سجن، یہاں جی ہی بارہ باٹ ہے

۲۔ تاباں

تاباں تخلص، میر عبد الحی نام، شاہ جہان آبادی۔ نہایت عزیز خوبصورت اور صاحب جمال تھا، ایسا کہ دلی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان سے دین و دل نذر کرتے تھے، اور پرے کے پرے عاشقان جانباز کے یاد میں اس لب جان بخش

[1] مکہ مسجد حیدر آباد میں اب تک موجود ہے۔ اس کا کھدوانا خلاف واقعہ ہے ۱۲

[2] مصنف نے حافظ کے اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ۔ ص

رموز مملکت خویش خسرواں دانند　　گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دل ربائی پر خود بدولت بھی دل کو کھو بیٹھے تھے، اور ہنستے ہنستے بے اختیار صبر اور اختیار کو رو بیٹھے تھے۔ اس بے دردی اور شیریں ادائی پر مانند فرہاد کے چاشنیِ درد سے آگاہ، اس سرد مہری اور لیلیٰ صفتی پر مانند مجنون کے ہمیشہ سرگرمِ نالہ و آہ تھے، یعنی ایک سلیمان نام لڑکے کو چاہتے تھے، اور اُس کے دردِ محبت سے، باوجود وصل کے، آٹھ پہر کراہتے تھے۔ وہی سلیمان، کہ بالفعل شاہ سلیمان کر کے معروف تھا، اور ادا کرنے میں راہ و رسمِ درویشی کے بہ شدت مصروف، اس مورِ ضعیف نے عالمِ پیری اُس کا سنہ ۱۲ بارہ سو ایک ہجری تھے، کہ بلدۂ لکھنؤ میں دیکھا۔ اگرچہ ریش سفید اور قد خمیدہ رکھتا تھا، لیکن اُسکے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی وقت میں بڑے بڑے گردن کش، سوئی کے ناکے سے نکالے ہوں گے +

غرض میر عبد الحی تاباں تخلص میرزا جان جاناں مظہر سے اور میرزا رفیع سودا سے ہمیشہ صحبت رکھتے تھے، بلکہ میرزا رفیع سودا بنابر اک علاقۂ مہر کے، کہ اُن سے رکھتے تھے، اُن کے اشعار کو اُن کے اصلاح کرتے تھے۔ عین شباب کے عالم اور جوبن کے عروج میں، کہ زمان فرمان فرما محمد شاہ فردوس آرام گاہ کا تھا، اس ماہِ تابانِ حُسن نے جامۂ زندگی کو مانند کتان کے چاک کیا
یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے +

سرسبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا		آخر خزاں نے کچھ نہ اُکھاڑا بہار کا
اکثر جو اس زمین کو ہوتا ہے زلزلہ		شاید گڑا ہے جسم کسی بے قرار کا
کس کس طرح سے دل میں گذرتی ہیں حسرتیں		ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا
اخگر کو چھپا رکھیں، میں دیکھ کے سمجھا	ولہ	تاباں تو تہِ خاک بھی جلتا ہی رہیگا
کوئی دوسرا مجھ سا تاباں نہ ہوگا	ولہ	کہ دل دے تجھے پھر پشیماں نہ ہوگا
جفا سے اپنی پشیمان نہ ہو، ہوا سو ہوا	ولہ	تری بلا سے، مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا
نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم		وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

بیتابیوں کی عشق کے کرتا ہے کیا علاج	ولہ	تاباں یہی جو دل ہے تو آرام ہو چکا
آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا	ولہ	جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا
ہیں بہت جامہ زیب، پر ہم نے		کوئی دیکھا نہیں یہ چپ ڈھب کا
یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا		ایسا قاصد تو جائیو لپکا ؟؟
دیا ہے جی میں اپنا دیکھ کر سج جیسکے جامہ کی	ولہ	اُسی کالے کے دامن کیجیو یارو کفن میرا
لیا تھا دوستی سے جن نے دل ہائے	ولہ	وہ اب دشمن ہوا ہے میرے جی کا
مجھے ترسا کے اس کافر نے مارا		نتیجہ کیا یہی تھا عاشقی کا
ہونٹوں پہ تیرے ظالم مسّی کی یہ دھڑی ہے	ولہ	یا اُن کے تئیں کسی نے ل ل کیا ہے نیلا
اکیلا صنم باغ میں کل گیا تھا	ولہ	اسے دیکھ کانٹوں پہ گُل لوٹتا تھا
لیا چاہ سے کھینچ یوسف کو اپنے	ولہ	ترا عشق تاباں قیامت رسا تھا
فغاں نے مرا مُنہ پھر آ کر کھلایا[1]		ابھی روتے روتے ہی چپکا رہا تھا
مری لوح تربت پہ یارو کھُدانا	ولہ	نہ اس سنگ دل سے کوئی جی لگانا
ترے غم سے نسیاں ہے یاں تک تو مجھ کو		اِدھر بات کہنا اُدھر بھول جانا
گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے	ولہ	کہ کچھ حاصل نہیں ہونے کا ساری عمر رو بیٹھا
صبا میرا پیغام اُن تک تو لے جا	ولہ	کہ تجھ بن رہیں ہم، کہاں یہ کلیجا!
کسی بات کا میں نہ شکوہ کروں گا		ترے جی میں آوے سو مجھ کو کہے جا
ایسے کے تئیں کوئی سر پر بھی چڑھاتا ہے؟	ولہ	کھینچے ہے تری زلفیں، کیا شوخ ہے یہ شانہ
تمہارے ہجر میں رہتا ہے غم ہم کو میاں صاحب	ولہ	خدا جانے جئیں گے یا مریں گے ہم میاں صاحب
مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن	ولہ	لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہی کیا قدرت

[1] یعنی کھلوایا ۱۲

غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا دامان ہے آج	ولہ	میں ہوں اور ہاتھ ہی اور میرا گریبان ہو آج
لے میری خبر چشم مرے یار کی کیوں کر	ولہ	بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر
کہتے ہیں اثر ہیگا گریہ میں ہیں یہ باتیں	ولہ	اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں
سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں	ولہ	کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں
بیمار ہے زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا بن		نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں
قسمت میں کیا ہو دیکھیں جیتے رہیں کہ مرجائیں		قاتل سے اب تو ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں
آشنا تو مجھ سے ایسا ہے کہ جیسا چاہئے	ولہ	پر جو کچھ دل چاہتا ہے ہائے وہ ہوتا نہیں
شب کو پھرے وہ رشک ماہ خانہ بخانہ کو بکو	ولہ	دن کو پھروں میں دادخواہ خانہ بخانہ کو بہ کو
گئے نالہ ترے برباد جوں بانگ جرس چپ ہو	ولہ	اثر دیکھا تری فریاد میں دل ہم نے بس چپ ہو
سلیماں کیا ہوا گر تو نظر آتا نہیں مجھ کو	ولہ	مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہے
بتاں کے شہر ناپرساں میں کب کوئی داد کو پہنچے	ولہ	مگر یہاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے
تو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہے	ولہ	کیا بھلا چاہنا ایسا ہی برا ہوتا ہے
تیری ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز		گوشت ناخن سے کہوں کوئی جدا ہوتا ہے
ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے	ولہ	تجھے بے مروت مروت کہاں ہے
میں شکوہ کروں جور ظالم سے لیکن		مجھے آہ و نالہ سے فرصت کہاں ہے
بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی		مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہے
جو اُس کی کمر میں نے دیکھی ہو تاباں		رگِ گل میں ایسی نزاکت کہاں ہے
جو کرتا ہوں فریاد میں اُس کے آگے	ولہ	تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے
ابھی پست ہو جاگا لاتوں کے مارے		ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے

لہ ہو جاگا یعنی ہو جائے گا۔

رباعی

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی ۔ بیخود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھ کو خمار شب کا لالا، صبح ہوئی ۔ شیشے میں جو کچھ کہ مے ہو باقی ساقی

مخمس

بیاں میں کیا کروں دیوانگی کا اپنی افسانہ ۔ نہ میرا گھر میں جی لگتا نہیں بھاتا ہی ویرانہ
خوش آتا ہی مجھے گلیوں میں سنگِ کودکاں کھانا ۔ ارے ناصح عبث ہی یہ ترا بیہودہ سمجھانا
پر یہ وہ ہو جُدا جس کا سو ہو کیونکر نہ دیوانہ

عبث مت بک نہیں میں مانتا کہنا ترا ناصح ۔ مری آہ و فغاں کرنے سے بتلا تجھ کو کیا ناصح
میں اپنے جی ہی سے بیزار ہوں مت تُو ستا ناصح ۔ بھلا چاہے تو اپنی آبرو کو لے کے جا ناصح
مجھے بیطرح آتا ہی تری باتوں پہ جھنجلانا

تو کیوں بیہودہ بکتا ہے نصیحت کے سخن اکثر ۔ سنوں کیونکر تری باتیں کہ میرا حال ہی ابتر
رہوں آرام سے بے یار اے ناصح بھلا کیونکر ۔ کہ میری زندگی اور موت ہی موقوف اس جا پر
اگر آوے تو جی جانا و گر جاوے تو مر جانا

کبھی راتوں کے تئیں کرتا ہوں گھر میں نالۂ افغاں ۔ کبھی پھرتا ہوں صحرا بیچ میں وحشت سے ہو عریاں
کبھو ہوتا ہی تاباں ساتھ میرے محشرِ طفلاں ۔ مرے تئیں اس طرح سے دیکھ کر سب خوار و سرگرداں
کوئی کہتا ہی سودائی کوئی کہتا ہی دیوانا

بابُ الجیم

۱۔ جہاندار

جہاندار تخلص، میرزا جواں بخت جہاندار شاہ نام، خورشید آسمانِ بلند اختری اور سرفرازی کا ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی کا، رونق دینے والا بارگاہ جہانداری اور جہانبانی کو، زینت بخشنے والا مسندِ ملک گیری اور کشورستانی کو، ہر خط جبینِ جہاں افروز کا اُس کے واسطے روشن کرنے عالم کے، مانند خطوط شعاعی آفتاب کے، دور کرنے والا تاریکی ظلالت کا تھا، اور دوست دریا نوال اُسکا

افراط جود وکرم سے مانند ید بیضا کے روشن کرنے والا خوش ناموسِ امارت اور ایالت کا بخشش نے اُس کی، دشمنی آسمان کے دل سے فلک زدوں کی نکالی، اور ہمت نے اُس کی گرہ بدطالعی کی پیشانی سے بدبختوں کی کھول ڈالی جس ایام میں کہ ناموافقت سے اُمرا و دولت کی۔ نشانِ کیوان شان اس فلک جناب کے دار الخلافہ دلّی سے بیچ حرکت کے آئے، تو ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری تھے، کہ خود بدولت و اقبال لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گذاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے کے سوائے گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ چار قدم کاہے کو چلے تھے۔ پانچوں ہتیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ حجرہ گاہ پر سے جا کر آداب بجا لاتے تھے۔ غرض اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی، کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعراے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے، اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرمجوشی فرماتے۔ چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس ہیچمدان نے یہ عذر کہہ بھیجا کہ "کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، ازبسکہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یارانِ عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں، اور اس تخم ناکاشتنی سمیغز کو موافق ارشاد کے زمینِ عرض میں بوؤں۔" پذیرا نہ ہوا، پھر چوبدار آیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ "تیرا حاضر ہونا مشاعرے میں نہایت ضرور ہے، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔" غرض ایما سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرفِ سعادتِ ملازمت کا حاصل کیا۔ مگر غزلیں اُس دن ازراہ تفضلات کے پڑھوائیں، اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنائتیں فرمائیں۔ پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد فرمایا۔ سنہ ۱۲۰۱ھ بارہ سو ایک ہجری میں بلدۂ بنارس کے اندر اس سریر آرائے بارگاہ شوکت و اجلال نے تخت نشینی ملک فنا کی چھوڑ کر اورنگ آرائی کشورِ بقا کی اختیار کی۔ یہ اشعار منتخب اُس سلطان عالی تبار کے ہیں۔

نہ پوچھو دہر میں کیا کر چلے ہم | اسی ہی آرزو میں مر چلے ہم
رہے اک شب جو اس ماتم کدے میں | بسانِ شمع رو رو کر چلے ہم
اکیلے تھے ہم اب اک فوجِ غم ہے | ترے در سے معِ لشکر چلے ہم
نہ تھے جوں گل کبھی اوراقِ دل جمع | کہ اس گلشن میں کر ابتر چلے ہم
رہے در پر بتاں کے تم جہاندار | خدا حافظ تمہارا گھر چلے ہم

ولہ

جدا ہو تجھ سے صنم سخت بیقرار ہوں میں | یہ دیکھ آئینہ ساں چشم انتظار ہوں میں
بسا ہے میرا سراپا جو عطرِ فتنہ سے | یہ کس کی نرگسِ فتّاں سے دوچار ہوں میں
نہ جور سے فلکِ حیلہ گر سے گھبرا کر | مثال ابر بہاری کے اشکبار ہوں میں
نظر پڑا ہے وہ آویزۂ گہر جب سے | صدف سے چشم کی تب سے گہر نثار ہوں میں
ہے آفتاب کا سر پہ مرے جو پرتوِ مہر | بسانِ ماہ جہاندار آشکار ہوں میں

ولہ

ہیں بسکہ جزو تن مرے طاؤس وار داغ | رکھتا ہے ایک ایک عجب ہی بہار داغ
رعنائی تیری دیکھ کے اے سروِ باغِ حسن | جوں لالہ دل پہ کھاتے ہیں سب گلعذار داغ
آتش پہ ہے کہ دل کی جہاندار جوں سپند | چاہوں جو ٹھہرے، اگر نہیں سکتا قرار داغ

۲- جرأت

جرأت تخلص، یحییٰ امان قلندر بخش نام، بیٹا حافظ امان کا۔ شاعرِ شیریں کلام ہے۔ ظاہرا لفظ امانؔ کا ان کے بزرگوں کے نام پر بطور خطاب کے زمان اکبری سے چلا آتا ہے، اور جرأت مذکور رشید شاگردوں میں میرزا جعفر علی حسرت تخلص کے گنا جاتا ہے۔ علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے، ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظرِ احکام ہے۔ تمام عمر عزیز کی بیکاری میں بسر ہوئی ہے، اور بے روزگاری میں کٹی ہے۔ ابتدا میں نواب محبت خاں محبت تخلص اعانت اخراجات ضروری

کی کرتے تھے، بالفعل، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، صاحب عالم وعالمیان میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کچھ امداد ہوتی ہے۔ اگرچہ بصارت چشم سے یہ عزیز معذور رہے، پر ملاقاتوں کو دوستوں کی پھرتا دور دور رہے گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے، لیکن مضمون رنگیں سوجھتا ہے، زبان ریختہ میں صاحب دیوان عظیم الشان۔ یہ اُس کا منتخب دیوان ہے +

وله
چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا ۔ دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا

وله
دن بدن تحلیل تو جرأت ہوا جاتا ہے کیوں؟ ۔ آہ! یہ بیٹھے بٹھائے تجھ کو کس کا غم لگا

وله
دل کو اے عشق سوئے زلف سیہ فام نہ بھیج ۔ رہزنوں میں تو مسافر کو سر شام نہ بھیج

وله
روشن ہے اس طرح دل ویراں کا داغ ایک ۔ اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

وله
میرے ہونے سے تو کچھ گرمیٔ بازار نہیں ۔ ہوں میں وہ شے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں
دل تو اُمڈے ہے پہ حیرت سے میں کیونکر رو دوں ۔ ابر تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں
درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا یار ۔ دہن زخم کو گویا لب گفتار نہیں
تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی ۔ جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

وله
جس کے غم میں آہ ہم آرام سے واقف نہیں ۔ کیا غضب ہے وہ ہمارے نام سے واقف نہیں
رو کے میں پوچھا کہ مقصد جانتے ہو تم مرا ۔ ہنس کے بولا میں کسی کے کام سے واقف نہیں

وله
کیا قتل دو عالم تونے جنبش سے اک ابرو کی ۔ اگر یہ جھوٹ ہو تو تیغ پر ہم ہاتھ دھرتے ہیں (یعنی قسم کھاتے ہیں ۱۲)
برنگ طائر تصویر ہیں ہم باغ حیرت میں ۔ کب اپنے آشیاں سے صحن گلشن میں اُترتے ہیں

وله
نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں ۔ آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

وله
اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں ۔ تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں
کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ ۔ چشم حسرت سے کہاں تک دم بہ دم دیکھا کریں
کہتے ہیں آپس میں ہمسایہ مری فریاد سے ۔ مصلحت یہ ہے کہ اس کے پاس سے گھر چھوڑ دو
کیا کیا میں نے گناہ جو اپنے لوگوں سے یہ تم ۔ کہتے ہو جا کر اُسے بستی کے باہر چھوڑ دو

آنے کی خبر ہے اُس کے لیکن	ولہ	آتا نہیں اعتبار دل کو
اُسکے آنے میں اب جو دیر ہے کچھ	ولہ	یہ بھی قسمت کا ہیر پھیر ہے گویا
جب نہ تب خون مرا ہی پیتا ہے		غم بہت اس کا مجھ پہ شیر ہے کچھ
تھا یہ جرأت ہی اُس کے کوچہ میں		وہ جو اک خاک کا سا ڈھیر ہے کچھ
جاتے ہیں اُس کے در سے یہ جانا محال ہے	ولہ	جس جا قدم پڑے ہے اُٹھانا محال ہے
روتے میں اور آتش اُلفت بھڑک اُٹھی		اب اس لگی کا دل سے بجھانا محال ہے
کیا قہر ہے کہ بزم میں اُس شوخ کی مجھے		سب کہتے ہیں کہ تجھ کو بٹھانا محال ہے
جا بیٹھتے تھے در پہ جو اُس کے وہ دن گئے		اُودھر کو اب تو آنکھ اُٹھانا محال ہے
کس کی سنوں بات میں اے مہرباں	ولہ	دھیان تو رہتا ہے تمہارا مجھے
غم بہت دنیا میں ہے پر عشق کا غم اور ہے	ولہ	ہے اسی عالم میں لیکن اُس کا عالم اور ہے
گر کسی ڈھب سے کوئی مجھ کو ہنسا دیتا ہے	ولہ	غم فرقت وہیں کچھ یاد دلا دیتا ہے
شب کو ٹک خواب جو آتا ہی تو ٹک اُسکا خیال		آنکھ لگنے نہیں پاتی کہ جگا دیتا ہے
لخت دل کی مرے یہ اشک رواں میں ہے بہار		برگ گل جوں کوئی دریا میں بہا دیتا ہے
گھر سے وہ جاوے جہاں میں بھی وہیں ہوں موجود		نہیں معلوم مجھے کون بتا دیتا ہے
سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہے مجھے	ولہ	گہ بٹھاتا ہے یہ اور گاہ اُٹھاتا ہے مجھے
دل بھڑکے ہے ٹک مصحف رو جان ف دکھادو	ولہ	سرگرم ہے آتش اسے قرآن دکھادے
رہنے کی جا جہاں میں ہم خوب پا گئے	ولہ	جوں درد اہل درد کے دل میں سما گئے
ہم گلشن جہاں میں جوں آتشیں انار		اک دم کی زندگی کا تماشا دکھا گئے
جوش گل چاک قفس سے دمبدم دیکھا کئے	ولہ	سب نے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے
شب بزم یار میں ہم بیٹھے تو تھے پر اُس کی	ولہ	چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یہاں سے نکلے

ف جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جاوے ۱۲

عزیز وصل میں بھی ہم جو رو رو کر نہ سوتے تھے	ولہ	سو اندیشہ تھا روز ہجر کا اُس دن کو روتے تھے
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی	ولہ	ٹک زلف سے جو رُخ پہ نظر کی تو سحر تھی
ترے بن بستر اندوہ پر کچھ یاد میں کر کے	ولہ	پڑا روتا ہوں پہروں یار منہ پر آستیں دھر کے

۳- جوشش

جوشش تخلص، شیخ محمد روشن نام، وطن ان کا عظیم آباد ہے، خوش لیاقتی ان کی جو کچھ کہئے اُس سے زیادہ ہے۔ طبیعت ان کی نظم ریختہ میں نہایت رسا ہے، اور معنی بیگانہ سے بہ شدت آشنا ہے۔ چاشنی درد کی کلام سے ان کے ظاہر، اور علم عروض سے یہ بخوبی ماہر ہیں۔ شیوہ اختیار انھوں نے میر درد کا کیا ہے، اور اس طور کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ جس ایّام میں یہ تذکرہ لکھتا ہوں، تو شیخ مذکور نے اشعار اپنے مجھ کو بنارس بھجوائے، تا کہ نام اُس کا اس تذکرہ میں لکھا جائے۔ نہایت پسند آیا مجھ کو اسلوب ان کے بیان کا، چنانچہ اس طرح لکھا گیا انتخاب ان کے دیوان کا ٭

کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا		قدرت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا
عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت		مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا
اس گلشن ہستی سے نکل راہ عدم لے		نیرنگ نظر آوے ہے کچھ رنگ یہاں کا
عنقا کی طرح گو کہ نشاں وہ نہیں رکھتا		ملتا ہے پتا نام ہی سے اسکے نشاں کا
اس دل کو دکھاتا ہوں میں بازار محبت		خطرہ نہیں جوشش مجھے کچھ سود و زیاں کا
ہم چشم کیوں کہوں میں اسے شعلہ زار کا	ولہ	عالم ہے کچھ جدا ہی دل داغدار کا
سرکار بے خودی کا یہ مختار کار ہے		کیا اختیار ہے دل بے اختیار کا
پیتا ہے گر تو بادۂ عشرت سمجھ وے		جوشش بڑا ہے درد سر اسکے خمار کا
بزم میں یک شب بھی زیبا نہ دل گلگیر کا	ولہ	فائدہ اسے شمع اشک و آہ بے تاثیر کا

دمبدم آلودہ رہنا خون سے عشاق کے — جوہر ذاتی ہے یہ جوہر تری شمشیر کا

وله

دیکھ کر رنگ صنم تیری جفا کاری کا — کوہکن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا
چشم پر آب ہے لب خشک دماغ آشفتہ — زور عالم ہے غرض دل کی گرفتاری کا
مسکراتا ہے مجھے دیکھ رقیبوں کے حضور — یاد ہے اس کو عجب طور دل آزاری کا

وله

جی سیر میں گلزار کی، تن کنج قفس میں — یہ صید گرفتار ادھر کا نہ اُدھر کا

وله

گر کوئی کاٹ بھی لے سر ترے دیوانے کا — پر یہ سودا تو کبھو سر سے نہیں جانے کا
کیوں نہ مضطر ہوں اُسے دیکھ کے دیکھو تو سہی — شمع کے سامنے کیا حال ہے پروانے کا
ہاتھ اٹھاتا ہی نہیں یار جو سلجھانے سے — دل تری زلف میں اُلجھا ہے مگر شانے کا

وله

سر اُس کی تیغ سے جب تک جدا نہ ہووے گا — کسی طرح سے حق اس کا ادا نہ ہووے گا
کل اُن نے بیٹھ کے غیروں میں کی نگہ مجھ پر — یہ تیر کس کے جگر میں لگا نہ ہووے گا
دل و جگر پہ ہی آفت نہیں فقط جوشش — جو ہے یہی ترا رونا تو کیا نہ ہووے گا

وله

غیروں پر تو ستم کرے گا — ہم پر جو کبھی کرم کرے گا
ہم سا ہی وہ ہوگا سادگی میں — باور جو تری قسم کرے گا
جوشش مت رو دل و جگر کو — کس کا کس کا تو غم کرے گا

وله

دیکھ کر حسن گلعذاروں کا — خانہ ویران ہوا ہزاروں کا
دیکھیں گر اس کی چشم پرفن کو — ہوش اُڑ جائے ہوشیاروں کا
اُس کی آنکھوں کو دیکھیے جوشش — منہ تو دیکھو شراب خواروں کا

وله

ہو چشم حباب وار دیکھا — ہستی کو نہ پائدار دیکھا
جوں شیشۂ ساعت اس جہاں میں — دو دل کو نہ بے غبار دیکھا
ہم مر ہی گئے پہ تو نہ آیا — بس ہم نے ترا قرار دیکھا

وله

اس ادا کا تری ہوں دیوانا — دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

آج ہے جاں بلب ترا جوشش
جی میں آوے ترے تو آجانا

ولہ
یاں مدعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا
ہے کوئی جسے تیرا طلب گار نہ دیکھا
سوتوں کو جگایا مرے نالے نے عدم کے
پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا
کل بزم میں سب پر نگہ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

ولہ
کہتا ہے ایک عالم انصاف کر ہمارا
سنتا نہیں کسی کی بیداد گر ہمارا
اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے
اپنی ہی عیب جوئی ہے یہ ہنر ہمارا
سرگشتہ اس جہاں میں جوں گرد باد ہیں ہم
تھک کر جہاں کہ رہ گئے وہ ہی ہے گھر ہمارا

ولہ
اپنا تو کچھ گناہ نہ آیا ظہور میں
کیا بات ہوگئی کہ وہ بیزار ہوگیا

ولہ
جہاں میں بادۂ عشرت پیا پیا نہ پیا
سلوک بخت نے ہم سے کیا کیا نہ کیا
نگاہ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے
سلام اُن نے ہمارا لیا لیا نہ لیا

ولہ
جب عشق میر اشہرۂ آفاق ہو گیا
اک عالم اُسکے حسن کا مشتاق ہوگیا
کس سے ہوئی ہے دوستی ایسی کہ ان دنوں
آنا ہمارا دل پہ ترے شاق ہوگیا

ولہ
ہوا ریگ رواں کی طرح جس جا کہ گذرا اپنا
بجز آواز کے کوئی نہ تھا واں ہم سفر اپنا
لگا دی دل میں آگ آہ سوزاں کیا کیا تو نے
جلا دینا ہے اپنے ہاتھ سے بھی کوئی گھر اپنا
شب فرقت ہی بیتابی دل ہی درد پہلو میں
نظر آتا نہیں ہم کو تو بچنا تا سحر اپنا

ولہ
تعلقات جہاں سے خبر نہیں رکھتا
ہزار شکر کہیں درد سر نہیں رکھتا
خفا ہوں جان سے دل کھول کر میں مرتا ہوں
تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا

ولہ
تجھ سے ظالم کو اپنا یار کیا
ہم نے کیا جبر اختیار کیا

ولہ
اُٹھ اے طبیب جا مجھے آرام ہو چکا
مرتا ہوں کوئی دم کو مرا کام ہو چکا
اب بھی کہیں اُٹھاویگا چہرے سے زلف کو
معمور تو شکار سے یہ دام ہو چکا

لینا تھا اُس کو دل سو لیا اُن نے نامہ بر　　اب میرے اُسکے نامہ و پیغام ہو چکا

تنہا یہ عشق میں نہ دلِ ناتواں جلا　وله　مانند نخل شمع ہر اک اُستخواں جلا
نہ دل رہا نہ چشم رہی نہ جگر رہا　　اے اشک تیرے ہاتھ سے کیا کیا مکاں جلا

وہ کیا ہوا زمانہ رونے میں جو اثر تھا　وله　یہ چشم خوں فشاں تھی یہ دل یہی جگر تھا

غش آگیا وہ سامنے میرے جہاں ہوا　وله　مجھ کو وصال یار میسّر کہاں ہوا

بے طاقت اس قدر یہ دل ناتواں ہوا　وله　حرفِ تواں بھی اُس کی زباں پر گراں ہوا
سر پر کھڑا ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں　　جلّادِ میری جان کا یہ آسماں ہوا

ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا　وله　مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا

کوئی اس غم کدہ میں اپنی غمخواری نہیں کرتا　وله　دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دلداری نہیں کرتا

جو ترے سامنے آئے ہیں سو کم ٹھہرے ہیں　وله　یہ ہمارا ہی کلیجا ہے کہ ہم ٹھہرے ہیں

ایک عالم کی جاں خراش ہے یہ　وله　آہ ہے یا قلم تراش ہے یہ
روئیے تا ہو سبز کشتِ اُمید　　اب تردد ہے یہ تلاش ہے یہ
دیدۂ تر کو دوست رکھ جوشش　　بہت تحفہ گلاب پاش ہے یہ

اپنی وہ بے ثبات ہستی ہے　وله　کہ سدا نیستی کو ہستی ہے
نام سُنتے ہو جس کا ویرانہ　　وہی سودائیوں کی بستی ہے

جی میں جس وقت کہ مضموں کمر آتا ہے　وله　بسکہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہے
چشم تر آہ بہ لب خستہ جگر ہوں جوشش　　بے طرح حال مرا مجھ کو نظر آتا ہے

شبنم کی طرح سامنے اُس آفتاب کے　وله　ہونے کو تو ہوئے تھے ولیکن نہ ہو سکے

کچھ کام نہیں ہمیں وفا سے　رباعی　تو ہاتھ نہ کھینچیو جفا سے
کل سب سے گلے گلے ملے تم　　تھے ہم بھی تو صورت آشنا سے

چشم سے غافل نہ ہوا چاہیئے　وله　اس کے مقابل نہ ہوا چاہیئے

دل کا ضرر جان کا نقصان ہے		اب کہیں مائل نہ ہوا چاہیے
فرہاد یہ بے فائدہ خارا شکنی ہے	وله	گھر کیجیے کس دل میں یہی کوہ کنی ہے
نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی مراد شمن ہے	وله	ایک یہ دل ہے غرض دوست ہے یا دشمن ہے
ایک دن کا ماجرا ہی میں اُٹھا تھا سیر کو	قطعه	دیکھتا کیا ہوں یہ جھگڑا ہے سر بازار ہے
برہمن کہتا ہے بت خانے میں ہے ذات خدا		شیخ کہتا ہے غلط کعبہ ہی میں دلدار ہے
اس میں جوشش بول اُٹھا سنتے ہو شیخ و برہمن		جانے دو اپنی طرف دیکھو یہ کیا تکرار ہے
ممکن نہیں کہ دیکھیے روئے شگفتگی	وله	جبتک برنگ غنچہ گریباں نہ پھاڑیئے
جاہ و حشم کی خواہش و دولت کی آرزو ہی	وله	دو دن کی زندگانی تس پہ یہ جستجو ہے
صورت پرست ہوں میں مانند آئینہ کے		جو کچھ ہے میرے دل میں سو میرے روبرو ہے
کہتا ہوں درد دل تو وہ کہتا ہے کیا مجھے	وله	چپ رہیے بس زیادہ نہ باتیں بنائیے
لاکھوں ہی کئے قتل گنہگار مجھی سے	وله	رہتی ہے مُڑی اک تری تلوار مجھی سے
کوئی سوائے شانہ وہاں چھوٹتا نہیں	وله	دیکھو تو کوئے زلف میں کیا بند و بست ہے
کشورِ عشق میں رسوا سر بازار ہوئے	وله	اُس کے ہاتھ آپ بکے جس کے خریدار ہوئے
میں آنہ سکوں اور صبا جا کے رہی ہے	وله	کوچہ میں ترے یار عجب باو بہی ہے
جی چاہے تو ملئے جو نہ چاہے نہ ملئے	وله	دل میں تو ہمارے نہ یہی ہے نہ وہی ہے
جوشش تو یہاں تک ہوا رسوائے خلایق		جو دیکھے ہے کہتا ہے یہ دیوانہ وہی ہے
دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آب ہے	وله	مانند شمع حال ہمارا خراب ہے
دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کی ہاتھ میں		جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے
اے عشق مجھے خوار کیا کیا کیا تو نے	وله	رسوا سر بازار کیا کیا کیا تو نے
جس طرح دل کا داغ جلتا ہے	وله	اُس طرح کب چراغ جلتا ہے
اُس رخ صاف کے آگے جو کبھی آتا ہے	وله	آئینہ اپنا ہی مُنہ دیکھنے لگ جاتا ہے

ہوے صحرا نشین تشریف لاوے جس کا جی چاہے	وله	در و دربان نہیں رکھتے ہیں آوے جس کا جی چاہے
گرہ میں غنچوں نے نافے کے نافے باندھ لئے	وله	چمن میں کھل جو گئی زلف مشک بو تیری
مرنا تو بہتر ہے جو مر جائیے	وله	جی سے کسی کے نہ اُتر جائیے
سوئے حرم یا طرفِ بت کدہ		الغرض اے شیخ جدھر جائیے
نت نئے عذر ہیں نہ آنے کے	وله	ہم دیوانے ہیں اس بہانے کے
قطرے مرے آنسو کے ہیں اک لخت شرر سے	وله	کیا آگ برستی ہے مرے دیدۂ تر سے
آشنا جب سے ہوئے اُس بُتِ ہرجائی سے	وله	دربدر خاک بسر پھرتے ہیں سودائی سے
گر جان دے کوئی پر نہ اس کے ہونگے	رباعی	جی شوق سے لیں گے اس کا جس کے ہونگے
جو شش نہ رکھ ان بتوں سے ہرگز اُمید		یہ کس کے ہوئے ہیں اور کس کے ہونگے

باب الحاء

۱۔ حاتم

حاتم تخلص، شاہ جہان آبادی مشہور ریختہ گویوں میں سے دلّی کے تھا ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور مرزا رفیع سودا کا، شاعر خوش بیان تھا صاحب دو دیوان تھا، ایک دیوان میں نہایت خرچ ابہام کیا ہے، اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ابہام کا۔

گلشن اُس گل بن مری نظروں میں ویراں ہوگیا		جھاڑ جھاڑ اور بوٹا بوٹا دشمنِ جاں ہوگیا
ایک نے پائی نہ اب تک نبض کی رفتار حیف		درد میرا تختۂ مشق طبیباں ہوگیا
اشک خوں آلودہ میرے اس قدر جاری ہیں آج		جا بجا لعلوں سے ہندستاں بدخشاں ہوگیا
شور دریا تک ملاحت کا تری پہنچا ہے شور		بے نمک آگے ترے لب کے نمک داں ہوگیا
فیضِ صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں		طفلِ مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہوگیا
سجن نے یاد کر نامہ لکھا اور ہم رہے غافل	وله	بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر

ولہ
ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی
کہ کہیں سب جہاں وصال ہوا

ولہ
مثالِ بحر موجیں مارتا ہے
لیا ہے میں نے اس جگ سے کنارا

ولہ
بالے پن سے مجھے سودا ہے ترے گیسو کا
بال باندھاسیاں بندا ہوں ترے گیسو کا

ولہ
مجھے درکار نہیں مشک و عبیر و صندل
ہوں دیوانہ میں پری رو کے چونکے لوکا
زور چپ تیرے ہے مرے دل کا کبوتر حاتم (بہت غافل)
ہیرت (خیال) کرتا ہے جب اُڑتا ہے اُسی کے کوکا

ولہ
ہر اک سخن ہوا ہے ہمارا مثالِ قند
شیریں لبوں کے جب ستی بوسے لئے ہیں ہم

ولہ
ترے رُخسار و قد نے دھوم ڈالا ہے گلستاں میں
اُدھر بلبل سسکتی ہے اِدھر قمری بلکتی ہے

ولہ
دو چار اب تجھ سے کیونکر ہوئے ہم چشمی کے دعوے سے
کہ نرگس کی چمن میں دیکھ کر گردن ڈھلکتی ہے
پری ہم جان کر اُس کو چھپائے شیشہ خالی میں
یہ تو بھی دخترِ رز پردۂ مینا سے تکتی ہے

ولہ
جب سے تمہاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں
تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں
زلفوں کا بل بتانا آنکھیں چُرا کے چلنا
کیا کج ادائیاں ہیں کیا کم نگاہیاں ہیں
حاتم کے بن اشارے سچ کہہ یہ چشم و ابرو
کس سے لڑائیاں ہیں کس پر چڑھائیاں ہیں

ولہ
تمہارے غنچہ لب کے شوق میں گلشن کی سب کلیاں
چمن میں سُن خبر آنے کی استقبال کو چلیاں
لگن میں تجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گذرا
شمع رو رو کے ساری رات سرتا پا کھڑی جلیاں

۲ - حزیں

حزیں تخلص، میر باقر نام، متوطن شاہ جہان آباد۔ شاگردوں میں میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ دلّی سے جب جدائی انہوں نے لاچار کی، تو عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ رفیق تھے نواب با فرہنگ سعید احمد خاں صولت جنگ کے، زندگی بسر کی ہے انہوں نے ساتھ رعایت نام و ننگ کے۔ بہت فہمیدہ اور آشنائے درست، دوستیوں میں نہایت چالاک و چست۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، خلاصہ اشعار ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں ؀

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا		ابر مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا
یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت!	وله	لکھا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا
گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جور یار آخر	وله	ہمیں رنج و الم سے ہو گئے صحبت برآ آخر
غم نے لیا ہے گھیر مجھے یاں تلک کہ اب	وله	دیتا ہے ساتھ دینے سے مجھ کو جواب دل
فصل گل آخر ہوئی، کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم	وله	کچھ کرلے صیاد، اب ہوں گے نہیں آزاد ہم
رحم آتا ہے مجھے اس مشت خاک اپنی پہ ہائے!		خوبرویوں کی ہوائیں ہو چکے برباد ہم
اس بے وفا کے ہاتھ سے کچھ مجھ کو حُسن نہیں	وله	پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دست رس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب		چاہیں کہ جل مریں، تو کہیں خار و خس نہیں
کچھ کہا شاید اُن نے قاصد سے	وله	دل پہ بیکرده اضطراب نہیں
آوے نہ کیونکہ رشک مجھے برگِ پان سے	وله	لیتا ہے کیا مزہ وہ سجن کے لبان سے
نہ وصل میں اُسے راحت، نہ ہجر میں آرام،	وله	کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں
تو نہ ڈر ٹک اٹھا نقاب کے تئیں	وله	میں سمجھاؤں[1] گا اضطراب کے تئیں
کیونکہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو	وله	کب یہ معنی لفظ میں آتے ہیں، کیا تحریر ہو
کچھ گئی ہجر میں، کچھ وصل میں گریاں گزری	وله	کیا مری عمر کی اوقات پریشاں گزری
خوباں کے درد و غم نے کیا ناتواں مجھے	وله	یاں تک کہ ہو بھی تن پہ ہوئے ہیں گراں مجھے
کیوں کر کروں جفا کی شکایت میں اُس ستی		کرتا ہے وہ وفا میں کبھو امتحاں مجھے
وفا میری اگر جور و جفا تجھ کو نہ سِکھلاتی	وله	تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی
حزیں میں دردِ دل کا کس طرح ظاہر کروں اُس سے	وله	مجھے کہتا ہے "تیری بات مجھ کو خوش نہیں آتی"
مجھے کہتا ہے "تیرا دل کہاں ہے"	وله	قیامت شوخ ہے میرا بدگماں ہے

[1] یہ لفظ تقطیع میں نہیں آسکتا۔ غالباً "سنبھالوں" ہوگا۔

۳ - حسرت

حسرت تخلص، میرزا جعفر علی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بیٹا میرزا ابوالخیر کا تھا۔ صاحب قصاید و دیوان ہے، اور سر حلقہ موزونان خوش بیان ہے۔ اکثر تو مشق لکھنؤ کے مع جرأت دم شاگردی کا مارتے ہیں، اور یا اُستاد کہہ کے پکارتے ہیں۔ نخاس کے اندر دُکان عطاری کی یہ عزیز رکھتا تھا، اور اوقات اسی وجہ حلال سے بسر کرتا تھا۔ سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں تختہ بند کرکے دُکان وجود کو سیر بازار عدم کی ہے، خدا بخشے اس عاقبت محمود کو ٭

اتنا سودا یہ دل زار ہوا، کچھ نہ ہوا — کچھ بھی یہ عشق سے بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا
کاشکے عشق جتاتا نہ میں اس کو حسرت — میری صورت سے وہ بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا

بجا تجھ کو مریضِ عشق سے ملتے حذر آیا۔ — کہ آئینے میں شکل اپنی جو دیکھی مجھ کو ڈر آیا
ولہ
رقیبوں کے حوالے کرکے خط کو نامہ بر آیا — عزیزو کیا کہوں قاصد تو میرا کام کر آیا!
ولہ
نہیں غنچوں پہ شبنم، اس دہن کے وصف نے اُن کو — یہ لذت دی کہ پانی مُنہ میں ہر غنچے کے بھر آیا
ولہ
اسی جہان میں رکھتے ہیں ہم جہان جُدا — حباب وار ہے اپنا بھی آسمان جُدا
ولہ
تری فرقت میں ہے شام و سحر مجھ کو عجب مشکل — جو شب کاٹی تو دن مشکل، جو دن کاٹا تو شب مشکل
کرم سے کھول جو عقدے پڑے ہیں کام میں میرے — ترے آگے ہیں سب آساں، اگر آگے ہیں سب مشکل
ولہ
ہوئے ہم بُت کے بندے، برہمن سی راہ کرتے ہیں — حرم کے رہنے والو! تم سی عشق اللہ کرتے ہیں
جلے جوں شمع، اب نزدیک ہے خاموش ہو جاویں — یہ افسانہ سنا کر قصہ ہم کوتاہ کرتے ہیں
ولہ
تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا — کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سی مژگاں کو
ولہ
برنگ آبلہ اے وائے یہ کیا زندگانی ہے — کہ جس کے پاؤں پڑتے ہیں اسی کو سر گرانی ہے

سلہ اصل مسودہ میں اسی طرح املا لکھا ہے ۱۲

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر اب آگے	ولہ	لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے کیا خاک بچی ہے جسے برباد کروگے
تیرے بن کس طرح پیارے مری اوقات گذریگی	ولہ	ابھی سے دل کو بیتابی ہی، کیونکر رات گذریگی
کیا راہ میں غیروں سے ملاقات لگائی اُلٹا جو زمانہ ہی تو اس صید نے دل کے	ولہ	جو صبح سے یاں آنے تلک رات لگائی صیّاد کے ملنے کے لئے گھات لگائی
اس زلف میں جا دفات پائی	ولہ	اس دل نے عجب ہی رات پائی
ہمارے کام پہ ہر چند آسمان پھرے چلا تھا لشکرِ غم چڑھ کے گھر پہ مجنوں کے دل دردبتاں سے آہ کیونکر نہ کرے وہ شکل ہے جیسی دشمنوں میں گھایل	ولہ رباعی	تجھے قسم ہے! جو تو اس طرف کو آن پھرے مجھے جو دیکھا تو وہیں ادھر نشان پھرے پر آہ تو تب کرے جو اس سے نہ ڈرے دم لیوے تو سر کٹے، نہ دم لے تو مرے

مہ حیرانؔ

حیران تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہان آباد کے۔ شاگرد رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص اُستاد[۲] کے۔ علمِ شعر سے تو بخوبی آگاہ نہیں ہیں، لیکن اشعار ان کے سب دلچسپ اور شیریں ہیں۔ بندش شعر کی ان کے اُستادانہ ہے، استاد جانتا ان کو ایک زمانہ ہے۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں مرحوم کی امارت میں، اگرچہ نوکر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مغفور کے تھے، لیکن رائے میکو لعل سے کہ مالک واصلباقی کا تھا، توسل رکھتے تھے۔ بعد ازاں مذکور کے مرنے کے ایک آدھ برس تو تنخواہ کی طرف سے اذیت اُٹھائی، پھر تو ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ مرحوم سے کچھ ایسی موافقت آئی کہ پچاس کے سو روپے اضافہ کیا، اور سو سوار کا رسالہ۔ بالفعل

لہ یہ مصرعہ جرأت کی طرف بھی منسوب ہے ۱۲ ے اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو اُستاد فن ہیں، حیراں ان کے شاگرد ہیں ۱۲

کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، مع رسالہ تنخواہ لکھنؤ میں لیتے ہیں، اور واد عیش کی دیتے ہیں۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے ہیں +

گر یہی وضع ہے، اور یہی ہیہات نصیب!
تو ہمیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب!

ہم لب گور ہوئے خوں بہ جگر اس غم سے
کرنی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب!

صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آہ جاگینگے مرے کون سی اب رات نصیب!

کچھ ہمیں شکوہ نہیں جور سے تیرے ہر گز
ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان کچھ اوقات نصیب!

مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھراتے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب!

ولہ

ہوا نہ ہم کو کبھی سیر باغ و گشت نصیب
کریں گے زیست کا کیا یا وہم زشت نصیب

دل ستمزدہ کا آج پوچھتے ہو حال +
غم فراق سے کب کا ہوا بہشت نصیب

ولہ

اپنے جانے کا وہاں دن کو ہی نہ رات کو ڈھب
دیکھئے کیسے بنے آن پڑی بات کڈھب

درد دل غیر کے ہونے سے نہ کہنے پایا
کل میسر ہوئی حیراں کو ملاقات کڈھب

دکھ اس سے کون کہے، تاب التماس کہاں
ہوا ہے اب تو نئے دوستوں سے ربط ولے

ولہ

کسے ہے ہوش بجا، دل کدھر، حواس کہاں!
تمہیں اب آنے کی فرصت ہمارے پاس کہاں

ولہ

کلیجا بھن گیا، کب تک کروگے ہائے بیدادی
اٹھوں میں ہی جہاں سے، یا کہ یہ اٹھ جائے بیدادی

ولہ

کل کہا میں نے میرے گھر چلئے
سن کے تیوری بدل لگا کہنے
مجھ کو کہتا ہے میرے گھر چلئے

اس میں کچھ کم نہ ہوگی محبوبی
"رسم و راہ ادب تو سب ڈوبی
دیکھیو اختلاط کی خوبی"

۵۔ حسرت

حسرت تخلص، ہیبت قلی خاں لقب، ساکن عظیم آباد کے۔ شاگرد میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ چند روز انہوں نے رفاقت نواب شوکت جنگ کی، کہ خلف نواب صولت جنگ

ناظم پرگنہ کے تھے، کی ہے۔ اور کچھ دنوں ان کو خدمت عرض معروض کی نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ کے حضور میں رہی ہے سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری کے اندر نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں بہادر صوبہ بنگ کی رفاقت میں نہایت غربت اور پریشانی کے ساتھ اوقات بسر کرتے تھے سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں اس سرائے فانی سے سفر کر گئے۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے، بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے۔ یہ انتخاب ان کے دیوان کا ہے +

رات کا سچ ہوا یہ خواب مرا		دل گیا صبح آفتاب مرا
تیرے کوچہ سے باز نہیں آتا		یہ دل خانماں خراب مرا
نہ جانوں کرے گیا حنا کا لگانا	ولہ	لہو پانی کرتا ہے یہ پان کھانا
عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا	ولہ	کبھی اُس کے کوچہ نہ آنا نہ جانا
بسکہ دکھ دیتا ہے میرے دل کو وہ بدخو مرا	ولہ	کل نہیں پاتا ہے مارے درد کے پہلو مرا
دل ہوا غم میں آب کی سی طرح	ولہ	پر جلے ہم شراب کی سی طرح
ہاتھ میں جام لے ملا مجھ سے		صبح کو آفتاب کی سی طرح
چھپاؤں اشک گلگوں کس طرح ہائے !	ولہ	گریباں ہو رہا ہے جا بجا سُرخ
اشک پر اشک چلا متصل آوے باہر	ولہ	یہاں تلک روئیے آنکھوں سے دل آوے باہر
بعد مرنے کے ہماری خاک کو برباد کر	ولہ	دے بگولے کو کہ لے مجنوں کا گھر آباد کر
ترے جمال جہاں گیر سے بنے کیوں کر	ولہ	میں ایک تیرا دیوانہ[۱] (بوزن دوانہ) ترا ہزار میں دل
زلف و رخِ یار دیکھتا ہوں	ولہ	کیا لیل و نہار دیکھتا ہوں
پھر پیار سے ان دنوں میں بارے		صحبت کو برآر دیکھتا ہوں

۱ اس لفظ کو قدما کے لہجے کے موافق بہ وزن نہ پڑھنا چاہیئے ورنہ مصرع ناموزون ہوگا ۱۲

آپ ہی اپنے یار تھے، جاتا نہیں — ولہ — غیر میں ہوتے تھے پہچانا نہیں

ہم نہ ہوں، تو ہو، تو سب چرچا کریں — ولہ — شمع ہے محفل میں، پروانہ نہیں

کعبہ بھی ہم گئے، نہ گیا ان بتوں کا عشق — ولہ — اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

مرگئے انتظار کے ہاتھوں — ولہ — کیا کہیں اپنے یار کے ہاتھوں

پھر مسیحا وہی کرے تو اٹھیں — سو کہاں روزگار کے ہاتھوں

فرہاد سے ہمسری کرے کون — رباعی — سر کس کا پھرا ہے یوں مرے کون

چل کشمکش جہاں سے حسرت — ہوتا رہے نت ورے پرے کون

سدا بارش ہی میں رہتی ہیں میری چشم تر ساون — ولہ — تو ایک دو دن برس کر ہم سے آسکتا ہی برساون

اڑا دے اے دوانے! شورش سودا سے سب ڈر کو — ولہ — بہار آئی، تو کیدھر دیکھتا ہی، پھونک دے گھر کو

مجھے افراط رقت میں بجا نہیں بات کر آئی — ولہ — کہ کر سکتا نہیں ڈوبا ہوا تقریر پانی میں

سنا ہے آج میخانہ میں جام مے پرستوں نے — ولہ — لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

ہم دوانوں کے نہیں عشق میں گھر جلتے ہیں — ولہ — اس محبت میں پرندوں کے بھی پر جلتے ہیں

دیکھ اس لب کو ترے، آگ ہیں لعل و یاقوت — تیرے ان دانتوں کی جھلکی سے گہر جلتے ہیں

ان پتنگوں کی ہیں جرأت پہ ہوا جاتا ہوں — بے کلیجے ہیں یہ کمبخت، قہر جلتے ہیں

تو جو مل گرمیاں کرتا ہیگا مجھ سے ہر دم — دیکھنے والوں کے حسرت سے جگر جلتے ہیں

نہ جی لگا یو اس سے جو دردمند نہ ہو — ولہ — کسی کا دل کسی ظالم کے پاے بند نہ ہو

گو دل بروں کے ماہ سے رخ پر نقاب ہو — ولہ — پوشیدہ ہو سکے ہے جو کوئی آفتاب ہو

لب بام آکے یہ تیرا کھڑے رہنا تو آفت ہے — ولہ — سوا نیزے پہ گویا آفتاب آیا، قیامت ہے

داغ دل بھی ہے تازگی پہ ہوئے — ولہ — اب شگوفہ بہار کرتا ہے

ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہی — ولہ — ادھر بہار، ادھر ایک شیشۂ دل ہے

پلا شراب، ہوائے شراب آتی ہی — ولہ — گھٹا بھی اپنا جھکڑ اکھڑی دکھاتی ہی

لے اُڑا کام اپنا پروانہ جیسے بھٹکے پھر آ گئے حسرت	ولہ	ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے یار کے دل میں گھر نہ رکھتے تھے
قفس ہی میں ہمیں رہنے دے صیاد تجھے کچھ بھی ہے حسرت فکر دل کی	ولہ	کہاں اب اُڑ سکیں جب بال و پر گئے کہاں کھویا اُسے تو ہائے گھر گئے!
ناصح عبث ملامت ہیں مبتلا کسو کے یہ گل ہزار اپنے جامے میں پھول بیٹھے	ولہ	کچھ دل بھی گیا پھرے ہر، پھیرے سے کیا کسو کے ویسے کھلے نہ دیکھے بندِ قبا کسو کے
جدائی کی ہوا دہکا گئی اب آگ سینے کی	ولہ	لگے اُڑنے بھبوکے آہ کے، کیا طرح جینے کی
ناشاد کا میرے حال جیسے نہ گیا یہ لوح مزار پر ہماری لکھنا	رباعی	جی تک میں دیا، ملال جی سے نہ گیا "ہم گئے، پہ ترا خیال جی سے نہ گیا"
زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یارو	رباعی	کہتا ہے کہ "کافر ہے تو اے روئے سیاہ" آتا ہے وہ بت، دیکھو اللہ! اللہ!
کب شہر کو چھوڑے، جو سیانا ہوگا ہم دونوں میں سیر کرکے دیکھا حسرت	رباعی	صحرا دیکھے گا، جو دوانا ہوگا؛ رہنا تو وہاں، جہاں کہ جانا ہوگا
میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز	رباعی	زاہد واعظ سے دور، بھٹکی بھٹکی یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

۶۔ حسن

حسن تخلص، خواجہ حسن نام، متوطن شاہجہان آباد کے، بیٹے خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین بن محمد شریف بن ابراہیم کے ہیں۔ جو کہ مشہور خواجہ کمہار کر کے تھے چشتی اور ساکن پہاڑ گنج ہیں۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں۔ علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر، اور استعداد اس علم کی ان کی تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں۔ اور فقر و درویشی میں

تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں۔ علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں، خصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں۔ توسل امورات دُنیا میں ان کو نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خان سے ہے، اور یوں ملاقات تو ایک جہان سے ہے۔ بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے، اُس پر مرتے ہیں، اور اکثر نام اُس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے لکھے گئے یہاں ہیں ٭

حال دل اپنا میں ہر ایک سے کہوا دیکھا		وہاں کسی ڈھب سے یہ ہوتے نہ پذیرا دیکھا
وقت نظارہ نہ رو، کہتے تھے اے چشم تجھے		شدتِ گریہ سے، لے خاک نہ سوجھا، دیکھا
گھورتے ہو مجھے کیا قہر کی آنکھوں سے تم		ایک عالم نے آپ کو گھورا دیکھا
دیکھنے سے مرے کاہے کو غضب ہوتے ہو		کیا غضب ہو گیا گر میں نے بھی دیکھا دیکھا
تب اس حیلہ گر کو نہ کچھ کام ہوگا	ولہ	کہ جب میرا یہاں کام اتمام ہوگا
یہی شورشِ عشق ہے تو الٰہی!		اس آغاز کا کیوں کہ انجام ہوگا
رہی بے قراری اسیروں کی یونہیں		تو صیاد! ٹکڑے ترا دام ہوگا
سوئے ہم تو، پر بے قراری وہی ہے		خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا
اگر نزع سے جان بخشی حسن کو		تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا
جو بندہ خانے میں آئیے گا، فقیر تم کو دعا کریگا	ولہ	کسی کے دل کو جو خوش کروگے خدا تمہارا بھلا کریگا
عالم اُس حور کی جو جلوہ گری کا دیکھا	ولہ	پھر یہ جلوہ نہ کسی حور و پری کا دیکھا
پہنچے وہاں کچھ جب تئیں پیغام ہمارا	ولہ	یہاں تب تئیں آخر ہی ہوا کام ہمارا
دل دلاسوں سے کرے ہے آہ و زاری بیشتر	ولہ	خانۂ ماتم میں ہو پُرسے سے زاری بیشتر
بھلا میں دِوانہ سہی، پر یہ ناصح	ولہ	مرے ساتھ بکتا ہے، عاقل کو دیکھو
یہاں تھک کے بیٹھے ہو کیا راہ میں تم		چلو راہ رو، اپنی منزل کو دیکھو
نمک جلا دے ہمیں گویا ہوتا	ولہ	اے لبِ یار مسیحا ہوتا

میں تو سب طرح سے تیرا ہوں میاں / پر جو تو بھی کہیں میرا ہوتا
مانوں تب وعدۂ فردا اے یار / جب ترے وعدے کو فردا ہوتا
اے مرے اشک سر مژگاں پر / قطرہ کیا ہووے ہے دریا ہوتا
تو جو ڈھونڈھے ہے حسن خلوت کو / عین خلوت میں اکیلا ہوتا
سر گریباں میں جھکا دل میں بیٹھ / مونده لے آنکھ کو تنہا ہوتا

ولہ
چلنے سے کب اشک ہارتا ہے / دریا ہے کہ جوش مارتا ہے

ولہ
آ کربلا سے قتل ہی کر جائیے مجھے / صورت اسی بہانہ سے دکھلائیے مجھے

ولہ
غم نے ایذا جو اے صنم بخشی / یہ بھی سرکار کی کرم بخشی

ولہ
حقیقت کہیں کیا ہم اس انجمن کی / نہ تھی واں خبر اپنے ہی تن بدن کی
اگر جاں کنی میں وہ جاں بخش آوے / تو ہو نزع سے جان بخشی حسن کی

ولہ
یہ تو نے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی / یہاں دل جلایا، اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی
کیوں تم خفا ہو، کب میں کسی بات پر میاں / موجب تمہارے قول کے تقریر کچھ نہ کی
کچھ اور تو ہوا نہیں ہی ساری عمر میں / تقصیر یہ ہوئی، کہ میں تقصیر کچھ نہ کی
مرتا ہی جاں کنی میں حسن حیف! تم نے رات / اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

ولہ
ٹک اپنا یہ رونے پہ اگر دھیان لگا دے / ساون کی جھڑی دیدۂ گریان لگا دے
شمشیر نگہ تیز ہے آگے ہی، جو چاہے / اور سنگ سی سرمہ کے ذرا سان لگا دے
دن رات مری تجھ سے دعا ہے یہی یارب! / اُس بت کا مجھے آٹھ پہر دھیان لگا دے

ولہ
کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے رہے / پر ٹک ایسا ہو کہ یہ دل تلملانے سے رہے
ہم نے ایسی بھی تو کچھ چوری نہ کی تھی آپ کی / بے سبب اب آپ جو ادھر کے آنے سی رہے
آہ کس کس بے وفائی کا میاں کیجے شمار / اور تو سب یکطرف، منہ بھی دکھلانے سی رہے
اُس نے کس کس طرح ٹالا ہم کو اپنے در سے پر / دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

۱۷۔ حسن

حسن تخلص، میر غلام حسن نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا، اولاد ہی میر امامی ہروی کے۔ دلی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے وارد لکھنؤ میں ہوئے نواب سالار جنگ اور خلف اُن کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے، اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہے اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچ مدانی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے، قریب آٹھ ہزار بیت کے انواع نظم میں دیوان ان کا ہے، اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبان ریختہ میں لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے، اور ۱۲۰۵ھ بارہ سو پانچ ہجری میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے۔
یہ اشعار منتخب دیوان ان نکوکردار کے ہیں +

گر کیجے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا		تو چاہئے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا
چھوٹا نہ وہاں تغافل اس اپنے مہرباں کا	ولہ	اور کام کر چکا یہاں یہ اضطراب جاں کا
نہ تھمتی تھیں آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو	ولہ	حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا
ایسی ہی آہ! باتیں اس بیوفا نے چھیڑیں	ولہ	روتے ہی روتے جس میں روزِ وصال گذرا
کچھ تو صدا ہو آہ! تہ خاک بھی، کہ جو	ولہ	اُدھر کو لگ رہا ہو حسن گوشِ نقش پا
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا	ولہ	جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا
چھوڑ دے کوئی کسی کیلئے جس طرح سے کچھ	ولہ	ہم نے منت میں تری کون مکاں چھوڑ دیا
اپنی جاگہ نہ ملے اور کہیں مجھ کو کیا	ولہ	تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
وہ ملک دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا	ولہ	سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا
دامن صحرا سے اُٹھنے کا حسن کا جی نہیں	ولہ	پانوں دیوانے نے پھیلایا، بیاباں دیکھکر

اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے، تو کیا | ولہ | ہو چکی وہاں بہار ہی آخر

اُس شوخ نے پھینکا ہے مگر تیر ہوا پر | ولہ | جاتا ہی جو دل کا مرے نخچیر ہوا پر
دیکھا جو وہاں اُس کو، گماں سو طرف گیا | ولہ | آئے نہ ہوئے کاش کہ ہم کوئی یار تک

آن کر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم | ولہ | شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم
اس کی جب بزم سے ہم ہو کے یہ تنگ آتے ہیں | ولہ | اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں
حُسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو، جی دیوے کون | | شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں
اپنے دل سے تو کبھی ہم ترا شکوہ نہ کریں | ولہ | ہو گر آزردہ تم ایسے ہی تو بولا نہ کریں
ترے بن باغ میں جس وقت غنچے دل کے کھلتے ہیں | ولہ | خراش ناخن غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں
نہ لپیٹ اس طرح منہ پر زلف کو بکھرا کے ای ظالم! | | ذرا اُٹھ بیٹھ تو اس دم کہ دونو وقت ملتے ہیں
ہے سزا دل کی جو زلفوں کے گیا پھیرے میں | ولہ | شب کو کیوں نکلا اکیلا، جو پھنسا پھیرے میں
کہتا ہی تو کہ تجھ سے میں ہی نباہتا ہوں" | ولہ | تو بھی کہیں ہو سچا ہیں یوں ہی چاہتا ہوں
مجھ پر ہی تیرا یہ ستم و جور کچھ نہیں، | ولہ | لیکن ترا ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں
رو ٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اور سی حسن | | یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے، اور کچھ نہیں
صیاد کی مرضی ہی یہ اب گل کی ہوس میں | ولہ | نالے نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں
وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی اُلفت | | ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں
دم رُکتا ہوا آتا ہی لب تک ترے غم سے | | عقدے پڑے ہیں بسکہ مرے تارِ نفس میں
دل اپنا اسی باتوں سی اُٹھ جاتا ہی تجھ سے | | جا بیٹھے ہی تو ل کے جو ہر ناکس و کس میں
تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہی کہیں | ولہ | جی دھڑک جاتا ہی میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو | ولہ | کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت | | شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گذرتی | ولہ | پر ایک جان تو ہی جس بن نہیں گذرتی

جان و دل ہیں اُداس سے میرے ‌— وله — اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

وله
ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو / میں بھی جی رکھتا ہوں مجھ کو بھی ہوس آتی ہے

وله
کیا چھیڑ سے پوچھے ہے کہ "گھر تیرا نہیں ہے"! / کہنے کو تو گھر یہاں ہے، پہ جی اپنا وہیں ہے

وله
سیر ہے تجھ سے مری جان جدھر کو چلیئے / تو ہی جب ساتھ نہ ہووے تو کدھر کو چلیئے
جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے گھبرا کے کبھی / دل مجھے چھیڑ کے کہتا ہے "ادھر کو چلیئے"

وله
نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے / ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے
دن توقع ہی توقع میں کہاں تک گذرے / مر گئے ہجر میں، بس اب تو کہیں یار ملے
جی تو ایسا ہی خفا تھا کہ نہ ملئے گا کبھو / پر ترے ہنس کے لپٹ جانے میں ناچار ملے

وله
گر بخت اپنے جاگیں تو اک کام کیجئے / سایہ میں اُس کی زلف کے آرام کیجئے
اب میں بھی بے قراری پر اپنی لیا قرار / بس خیر! آپ شوق سے آرام کیجئے

وله
بھولے سے نام لے کے مراہٹ بتا گیا / پیاری لگی یہ مجھ کو تری بات آج کی

وله
کئی دن ترے چپ رہنے میں اشک آنکھوں سے برسائے / نکل خورشید رو گھر سے کہ عالم خوب ترسائے

وله
ترا ہر چند دل تجھ سے بھی کچھ سخت تر سا ہے / ولیکن سخت اگر کہئے، تو کب میرے جگر سا ہے
گریباں چاک اور خاموش مجھ کو دیکھ کہتا ہے / "کروں کیا بات اس سے، یہ تو کچھ دیوار در سا ہے"

وله
رہنے نہ دے گا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی / کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھوئیں عبث بھرم بھی

وله
دریا میں ڈوب جائیے، کہ یا چاہ میں پڑے / اے عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے
آ جا کہیں شتاب! کہ مانندِ نقش پا / تکتے ہیں راہ تیری سر راہ میں پڑے

وله
یوں غیر کچھ نہیں، تو بلا کو بُری لگے / تو کچھ نہ کہہ، کہ ہم غُربا کو بُری لگے

وله
کیا ہنسئے اب کوئی اور کیا رو سکے / دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

وله
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا / بس اے زندگی! ایسی ہستی سے گذرے

وله
آنکھوں کو اُس کی دیکھا تو ہستی نظر پڑی / پھر ساتھ اُس کے بادہ پرستی نظر پڑی

سارا جہاں خراب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر
بارے وہ آج آیا تو بستی نظر پڑی

ولہ

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہئے
انصاف کر تو، چاہئے یہ یا نہ چاہئے؛
مجھ سے نے تجھ کو چاہا تو چاہا عجب نہیں
تجھسا جو مجھ کو چاہے، تو پھر کیا نہ چاہئے

ولہ

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اُس گلی کے تنکو
رہتے ہیں ہم وہ اپنے روز ازل سے تنکے (یعنی اُن کے)

رباعی

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں
چاہت میں کسی کی ہیں، نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح
سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

رباعی

ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے
ہر لحظہ نیا شوق دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے، کس نے روکا تم کو؟
اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد۔

نہیں یہ لکھنؤ، ہے یہ زمانا
زمانے پر عبث رکھنا بہانا
زبس یہ ملک ہے ہنجر یہ بستا
کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ ہیں
زبس گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں ہی غیر کا دم
سیہ گِل سے گلی یوں تر رہے ہی
بغل جس طرح زنگی کی بہے ہے
فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہی
ہر اک گھر تنگ کا سا دل یہاں ہی
کنواں بھی یوں ہے پھر اس تنگ گھر میں
پڑے پُتلی کا تل جیسے نظر میں
کنواں کہنا اسے ہے عقل سے دور
کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور
کہوں کیا میں قدامت اس مکاں کی
پڑی بنیا د بعد اس کے جہاں کی
ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ
ولیکن مثل زلف زشت رد ہیچ
جو اس کے زیر سایہ آن نکلے
رُکے دم، اور اُس کی جان نکلے
جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر
پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

نہیں امکاں جو گھر اپنا وہ پاوے
بلا خورشید کو جب تک نہ لاوے

زبس کوفے سے یہ شہر ہم عدد ہے
اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے

چڑھے ہے گومتی جب گرد آکر
حباب آسا بہے پھرتے ہیں سب گھر

رکھے ہے پار ہو سکنا تب امکاں
چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں

سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور
سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور

چلا میں یہاں سے دل اپنا اُٹھا کر
کہ کیجے سیرِ فیض آباد جاکر

عجب معمورۂ آباد پایا
مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا

کھلا بازار اور رستہ کشادہ
بیاضِ جدولی جیسے ہو سادہ

دو رستہ راستے میں اتنا رستا
کسی نے آج تک دیکھا ہی بستا

وہ جی ہے شہر کا ترِپولیا یوں
کہ جیسے تین رُوحیں جسم میں ہوں

اُدھر کو جوہری، اُودھر کو بزّاز
اِدھر صرّاف، اور اُدھر طلاساز

روپے اور اشرفی دیکھے برستے
دیئے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے

یہ فِرنی اور فالودے کا عالم
یعنے فِرنی
کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم

ملا شربت میں جو اُس کو بتاوے
شبِ مہ کا سما پانی میں پاوے

ملائی دودھ کی دیکھو تو گویا
اُسی میں مال حلوائی نے کھویا

بلندی پر ہے حلوائی کی دُکّاں
ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں

دھری ہیں گولیاں اور یوں اندرسے
کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے

مٹھائی کی کروں تعریف تا چند
قلم کی ہوگئی اب تو زباں بند

ھزاروں خانگی اور کسبی آکر
کریں ہیں سیرِ لالہ دل لگا کر

چمک دامن کی دکھلا یوں چلے ہے
کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو ملے ہے

وہ سبزہ کان میں زیبِ بناگوش
کہ جس کو دیکھ طوطی کے اُڑیں ہوش

شعاع اس کی یہ اور منہ کا پسینا — ہے گویا پھول پر شبنم کا مینا
کوئی کُرتی پہن جالی کی سادہ — گریباں کر کے چھاتی تک کشادہ
کیا اس دام میں تکمہ کو یوں صید — سحر کے جوں گریباں میں ہو خورشید
مسافر اس طرف جو آن نکلے — نہ نکلے وہاں سے غیر از جان نکلے

بابُ الخاء

۱۔ خاکسار

خاکسار تخلص، محمد یار نام، شاہ جہان آبادی۔ قدم شریف کے خادموں میں سے تھا، بڑا ہی مشّاق زبان ریختہ کا۔ ہمیشہ محمد تقی میر تخلص سے نوک جھوک کرتا رہا ہے، اور ان کے اشعار میں مشاعروں کے اندر اکثر تصرف کیا گیا ہے۔ صاحبِ دیوان اور شاعر خوش بیان تھا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "شعر اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے ہیں، اس جہت سے اشعار اس کے داخل اس تذکرے کے کمتر ہوئے ہیں۔" یہ اشعار طبع زاد اس کہن اُستاد کے ہیں +

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعاں عزیز — ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز
کل مجھے قتل کر اُس دشمن دیں کافر نے — بولا لوگوں سے یہ تھا مرد مسلمان عزیز
کیوں نہ وہ مصحفِ رو جان سے مجھ ہووے زیاد — کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز
خاکسار عشق[۱] سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج — آپ میں آ ذرا، اپنے تئیں پہچان عزیز

ولہ
دل شیفتہ کر کے کیا لیا تو — اے خانہ خراب! کیا کیا تو

ولہ
تیری زلف سیہ سے اے پیارے — مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے

ولہ
قیامت بھی ہوگی تو میری بلا سے — مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

[۱] تقطیع میں عین گرتا ہے ۱۲

روونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی	ولہ	اس خانماں خراب کو چپکا خدا کرے!
کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے	ولہ	آہ! جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سے

باب الدال

۱- درد

درد تخلص، خواجہ میر نام۔ متوطن شاہ جہان آباد کے، خلف الصدق حضرت ناصر دہلوی کے۔ ثابت قدمی میں اس قطبِ آسمانِ استقلال کی، اور زاویہ گزینی میں اس مرکزِ دائرۂ فضل و کمال کی یہ نقل مشہور ہے، اور زبان زد جمہور رہے، کہ جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرتِ جنت النعیم تھا، تو معموری پر شہر کی عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور وہ خراب آباد تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ تھا۔ جبکہ متواتر نزولِ آفات کے باعث، اور مکرر ورودِ بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا، تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صابرِ زاویہ گزین نے، اور ہر توانگرِ بالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والا تبار، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اُس قطبِ آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔ اگر شیخ فرید شکر گنج اُس کوہ تحمل کو دیکھتا، تو چاشنئ فقر اُس کی حیران ہو کر مانند نیشکر کے انگشت تحیر کو کاٹتا۔ اور اگر سید حسین خنگ سوار بیچ اس عرصہ کے ہوتا، تو زین پوش خدمت کا اُس کے کاندھے پر ڈال کے دوڑتا ہے۔

غرض اس مجمع فضل و کمال کی التفاتِ طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے بلکہ واسطے گرمانے افسردہ دلانِ خام کے ہے۔ اُس شہسوار معرکۂ سخنوری کے توسنِ تند خرام قلم نے بیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی، اور اُس یکہ تازِ عرصۂ مضمون

تراشی کے ست رنگ آسمان سخامہ سے بیچ میدان بلند مقامی کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی تعجب نہیں ہے اگر اُس عندلیب گلشن معنی کے کلام معجز نظام کی تحریر سے صفحہ کاغذ کا ہمرنگ برنگ گل ہو، اور نغمہ زبانِ قلم کا ہم آہنگ صفیرِ بلبل ہو۔ اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے، لیکن سراپا درد و اثر ہے۔ زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسایل تصوف میں بیشتر طبیعت آئی ہے، اور شرح بھی اُس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے۔ طریقۂ فقر میں بہت بڑے کاسب اور شاغل تھے، اور راہِ طریقت کے طالبوں کے واسطے رہنماے کامل تھے۔ بسنہ ۱۲۰۲ بارہ سو دو ہجری میں اُس بلبل گلشن آزاد نے دام ہستی سے نکل کر شاخسار کو چمن عدم کے آباد کیا ہے۔ یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے۔

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا		حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن		آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا
مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی		کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا
اہل زمانہ آگے بھی تھے، اور زمانہ تھا	ولہ	پر اب جو کچھ ہے، یہ تو کسی نے سنا نہ تھا
باور نہیں ابھی تجھے غافل پہ عنقریب		معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا
یک بیک نام لے اُٹھا میرا	ولہ	جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا
گل و گلزار خوش نہیں آتا	ولہ	باغ بے یار خوش نہیں آتا
جاں پہ کھیلا ہوں میں، میرا جگر دیکھنا	ولہ	جی نہ رہے یا رہے، مجھ کو اُدھر دیکھنا
ذکر وفا کیجئے اُس سے کہ واقف نہ ہو		کہتے ہو کس سے یہ تم ٹک تو ادھر دیکھنا
باہر نہ آسکی تو قیدِ خودی سے اپنی	ولہ	اے عقل بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یاں		جی میں سما رہا ہے از بس غرور تیرا
ہم نے چاہا بھی، پر اُس کوچہ سے آیا نہ گیا	ولہ	وہاں سے جو نقش قدم دل کو اُٹھایا نہ گیا
چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم	ولہ	بہار باغ گو یوں ہی رہے لیکن کدھر شبنم

تیری خون آشامیاں مشہور ہیں ای تیغ یار — ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو

ولہ

اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

ولہ

نہ ہاتھ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے — کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جاوے — کہ زندگانی عبارت ہی تیرے جینے کی

ولہ

جو ملتا ہے ل اچھے کہاں زندگانی — کہاں ہیں، کہاں تو، کہاں نوجوانی

عجب خواب در پیش ہے پھر تو سب کو — سنا لو تنک اب اپنی کہانی

۲- دردمند

دردمند تخلص، فقیر صاحب نام۔ دکن ان کے بزرگوں کا وطن ہے، بلکہ ان کا بھی مولد دکن ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہجہان آباد میں پائی ہے، اور خدمت سے میرزا جان جاناں مظہر کی کیفیت آدابِ فقر کی اُٹھائی ہے۔ مرید بھی مرزائے مذکور کے تھے۔ چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی ہے، اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذرانِ معاش کی ہے۔ بعد اس کے پھر دلّی گئے، اور چند مدت وہاں رہے پھر نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ بھتیجے نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بُلائے ہوئے شاہجہان آباد سے مرشدآباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہیں ٹھہرائے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہِ احوال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ گیارہ سو چھتر ہجری میں بلدۂ مرشدآباد کے اندر انتقال ہوا۔ سلیقۂ سخن رسی میں اُستاد تھے، اور طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیادہ تھے۔ فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور ہے، اور ہندی میں تو یہی ساقی نامہ مشہور ہے ✦

بڑی اُس کی خوبی کی ازبسکہ دھوم — لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم

ارے ساقی! اے جانِ فصل بہار! — یہی تھا ہمارا و تیرا اقرار

ہمارے بسرنے کی یہ فصل تھی؟ — فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟

ف اس مضمون کو شیخ ابراہیم ذوق نے اس طرح باندھا ہے ۔ کہے ہے اس سے دم ذبح یہ گلو میرا ۔ کسی کی وجہ سے کرے تو پیئے لہو میرا ۔ لیکن درد کی بندش کو نہیں پہنچتا ۱۲

تری جان کی سوں (قسم) غنیمت ہوں میں
سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں

مری عقل میں کون انباز ہے
ارسطو مرا اک دوا ساز ہے

فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار
نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روبکار

نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف
شگوفہ کو آیا ہے مستی سے کف

چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک
کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک

تجھے جان گل کے لہو کی قسم
تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم

تجھے جام کے چشم تر کی قسم
تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم

ادا سے لہکنے کی تجھ کو قسم
نشہ سے بہکنے کی تجھ کو قسم

تجھے جام صہبا کے سر کی قسم
تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم

تجھے نازِ مستی کی اپنے قسم
تجھے خود پرستی کی اپنے قسم

قسم ہے تجھے بے سبب جنگ کی
قسم ہے مرے نام کے ننگ کی

ارے بے وفا بے مروّت صنم
میں دیتا ہوں تجھ کو قسم پر قسم

تجھے دخترِ رز کی حرمت کی سوں
تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں

تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں
تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں

تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں
تجھے بیقراروں کی فرصت کی سوں

شبِ عید کے تجھ کو چاؤں کی سوں
تجھے اپنی مہندی کی پاؤں کی سوں

جو تونے کیا مے کو مجھ پر حرام
تو اتنا کر اے ظالموں کے امام

کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال
مرے خون کو اپنے اوپر حلال

تجھے رحم مجھ پر کچھ آتا نہیں
مگر جینا میرا بھاتا نہیں

نہ توڑ آئینہ اپنے خریدار کا
زیاں خوب نیں اپنی سرکار کا

یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن
تری مہربانی کا مجھ کو گمان

تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات	نگل جائے جی ناامیدی کی ساتھ

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد	رباعی	اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانہ عشرت پر		سنگ آیا ولیک سخت آیا فرہاد

۳-دل

دل تخلص، شیخ محمد عابد نام- متوطن بلدہ عظیم آباد کے بے مثل، اور بے نظیر عالم محبت و وداد کے شیخ محمد روشن جوشش تخلص بڑے بھائی ہیں، جن کی خوبیاں باب الجیم کے اندر بیان میں آئی ہیں- غرض دونوں بھائی سنجیدہ اطوار اور حمیدہ خصال ہیں، طریقہ یک رنگی میں بے مثال ہیں یہ ابیات دل خراش اُس اہل دل کی تلاش سے ہیں[ل]٭

تیری زلفوں میں پھنسا دل ہی تقصیر ہوئی	نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل
نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں	ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ	رہتا ہے مدام آب دیدہ
تمہارے در پہ جو دربان نے آستیں پکڑی	برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

۴-دیوانہ

دیوانہ تخلص، رائے سُرب سکھ نام، رشتہ دار راجہ مہانراین کا تھا- نہایت پرگو- اور وضع مغلیت پر مرتا تھا- دو دیوان زبان فارسی میں اس نے لکھے ہیں، اور اکثر ریختہ گو، لکھنؤ کے، مرزا جعفر علی حسرت، اور میر حیدر علی حیراں، اس کے شاگردوں میں سے ہیں سنہ ۱۲۱۱ھ بارہ سو

[ل] اصل کتاب میں نمونہ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف ہی کو نہیں ملا یا جس نسخے سے ہم نے نقل کیا ہے اس کے کاتب نے چھوڑ دیا ہے یہ مندرجہ بالا چار شعر ہم نے سخن شعرا، مصنف عبدالغفور خاں نساخ سے نقل کئے ہیں ٭

چار ہجری میں لاچار گرم روی راہ عدم میں کی، اور آتشِ فنا پیکرِ وجود کو دی۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے زیادہ ہے۔ یہ ہندی اس کا طبع زاد ہے ◆

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر		گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر
بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے وے		گرمیٔ بزم کہاں اُس بت عیار بغیر
دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا		ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر
جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے		بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے		کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اُس یار بغیر
دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے	ولہ	رستم کا کیا جگر ہے جو زہرا اچھل نہ جائے
وے یار کہاں کہ یار باشی کیجے	رباعی	وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشہ میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا		اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

بابُ السّین

۱۔ سَودا

نامِ نامی اور اسمِ گرامی اُس شاہ بازِ عرش پرواز معنی کا مرزا رفیع ہے۔ متوطن دار الخلافہ شاہجہان آباد کے۔ بیشک مقام اُن کی طبیعتِ فلک فرسا کا موافق اُن کے نام کے نہایت رفیع اور منیع ہے۔ روز تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دِلّی میں ساتھ کمال عزّ و وقار کے رہے، اور طبع رسا کی مربی گری سے انیس و جلیس سلاطینِ نامدار اور وزرائے عالی تبار کے رہے۔ اگرچہ

لہ مصنف نے جس خاص استعاروں میں رائے سرب سنگھ دیوانہ کے انتقال کو بیان کیا ہے، اُن میں ایک خاص جھلک پائی جاتی ہے، جو مصنف کی فراخدلی پر شاہد ہیں ◆

ذات اُس یگانۂ روزگار کی کثرتِ اشتہار کے باعث مستغنی ہے تکلیف سے خامۂ مدائح نگار کی، لیکن انصاف کہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا احوال اس مستغنی الصفات کا لکھا چاہیئے، اور تذکرے سے اُس شاہ بیتِ کلیاتِ معانی کے، بیان کو ان اوراق پریشان کے، زیب و زینت دیا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرزائے مذکور سرِ حلقۂ سخنوران اور سر آمدِ معنی گستران تھے۔ آشنائے معنی بیگانہ اور مضمون تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے۔ اقسامِ نظم سے دیوان اس مطلعِ دیوانِ سحر بیان کا بھرا ہے، اور انواعِ نظم کو کیا کیا زور و شور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً طرزِ قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کرکے اس طاقِ بلند پر رکھا کہ دستِ وہم نازک خیالانِ ہندستان کا اس کے خیال تک نہ جا سکا۔ آگ گویا دیں اُس آتش زبان کے ہجومِ شرار سے جوشِ قطراتِ عرقِ انفعال ہے، اور پانی کو خجالت سے اس طبعِ روان کی خاک میں چھپنے کا خیال زبانِ ہندی شرفِ ہمزبانی سے اُس کی سرفراز، اور نظمِ ریختہ کو طبعِ معنی آفرین پر اُس کے گھمنڈ اور ناز۔ جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہان آباد کے نقل و حرکت کا اتفاق میرزائے مذکور کو اس شہر سے ہوا، تو اَور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طورِ سکونت کا کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی، اور چھ ہزار روپے سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔ چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں، اور کیا کیا ترو تازگی کے ساتھ مضامینِ عالی باندھے ہیں۔ جب کہ سنِ شریف اس خضرِ راہِ سخن دانی کا ستر برس کو پہنچا، تو داعیِ اجل کو لبیک اجابت کہہ کے سرائے وجود سے پیما منزلِ عدم کا ہوا۔ تاریخ وفات اُس رفیع قدر محفلِ نکتہ دانی کی ہر ایک سخن سنج نے کہی ہے، لیکن یہ تاریخ اُس فرہادِ بے ستونِ مضمون تراشی کے سنگِ مزار پر کندہ کی ہوئی ہے +

خلد کو جب حضرتِ سودا گئے	فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کر پائے عناد	شاعرانِ ہند کا سرور گیا

۱۱۹۵ھ

آغا باقر کا امام باڑہ اس محبِّ امام علیہ السلام کا مدفن ہے، سایۂ قدومِ امام کے باعث

بیشک رنج مکافات کے واسطے مامن ہے - یہ اشعار یادگار جریدۂ روزگار کے لکھے جاتے ہیں اور یہ اوراق پریشان اس سے زینت پاتے ہیں +

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

ہنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا
کہ ہو جو تیغ بے جوہر اسے ہے ننگ عریانی

خوش آمد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی
نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی

کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی

یہ روشن ہے برنگ شمع ربط باد و آتش سے
موافق گر نہ ہووے دوست، ہے وہ دشمن جانی

ولہ

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک
جوں شمع زندگانی مری ہے زباں تلک

بے ماتم اس چمن میں نہیں خندۂ طرب
ہے کسوت کبود گل زعفراں تلک

لاف سپہ گری نہ بکے مرد راست باز
پاوے نہ راہ حرف زبان سناں تلک

سختی سے گذری اہل سعادت کی یاں معاش
ہے منحصر غذائے ہما استخواں تلک

مطلع ثانی

جس کی بہار پہنچی نہ آخر خزاں تلک
آیا نہ ایک گل کبھی اس بوستاں تلک

وہ مرغ ناتواں ہوں کہ صحن چمن سے میں
بے نردبان پہنچ نہ سکوں آشیاں تلک

روضہ میں جن کے حلقۂ چشم ملک سوا
پہنچا نہ پائے شمع کبھو شمعداں تلک

ہنگام طوف بسکہ ملائک ہمیشہ واں
لیتے ہیں خاک ان کے اس آستاں تلک

خادم کہے ہیں وہاں کے یہ آپس میں دیکھ کر
پہنچے ہے کوئی دن کو زمیں آسماں تلک

رہنے کو جگ میں صورت افسوس کے تئیں
احکام خورمی نے کیا منع یہاں تلک

انگشت چوسنے کے لئے طفل شیر خوار
ممکن نہیں کہ لاسکے اپنے دہاں تلک

اس چرخ دوں پرست تلے بہر مشت جو
مانند آسیا کے پھروں میں کہاں تلک

قصیدہ

ہے سخن سنج اِک جوانِ متیں
فخر صائب جو وہ کرے تحسیں

رات جا کر میں اُس کی خدمت میں
اُسے دیکھا تو تھا نپٹ غمگیں

میں جو پوچھا ؟ کہا سبب مت پوچھ
خبث کرنا کسی کا خوب نہیں

لیکن اے یار تجھ سے کہتا ہوں
مل کے گو مجھ پہ سب کریں نفریں

داغ ہوں اُن سے اب زمانے میں
بزم شعرا سے ہیں جو صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائمؔ و دردؔ
لے ہدایت سے تا کلیم و یقیں

کیا غرور و دماغ و کیا نخوت
کون سا کبر ہے جو اُن میں نہیں

مثل سشیرازۂ کتاب اللہ
سمجھے ہر ایک اپنی چین جبیں

ننگ جانیں جو بزم کا اُن کی
بو علی ہو صف نعال نشیں

اور جو احمق اُن کے سامع ہیں
دم بہ دم اُن کی کیا کریں تحسیں

جیسے سُبحانَ مَنْ یرَّانِی پر
لڑکے مکتب کے کہتے ہیں آمین

شعر و تقطیع اُن کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقش نگیں

اُس میں جو دیکھئے تو آخر کار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں

اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
میخ در کون آسمان و زمیں

غرض اس خبث کے تئیں سُن کر
ہو کے بے اختیار میں وہیں

کہا سودا کو اُن بزرگوں میں
مت گنو اُس کا ہی یہ کیا آئیں

اور جو ہووے بھی تو لائق ہے
فخر کرنا پھبے ہے اُسکے تئیں

ہے وہ مداح ایک ایسے کا
مسند جاہ جس کی عرش بریں

یعنی نواب سیف دولہ سدا
جس کی شمشیر و فرق دشمن دیں

رفعتِ دستِ جود سے جس کے — دامن خلق کا ہے یہ آئین
پنجۂ آفتاب کی سی طرح — بہرہ ور ہے ہمیشہ روئے زمیں
غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا — تیری بخشش نے مشتِ زر کی تئیں
دست و پا اپنے گم کرے ہی عدو — یاد کر تیری تیغ و خنجر کیں
پوچھتا ہے ہر ایک سے سچ کہہ — سر مرا ٹنگڑیوں میں ہی کہ نہیں
فکر میں قہر کے ترے ہر شب — حالت نزع سے زبس ہی قریں
نیند اُس کو نہ آوے تا نہ پڑھیں — جاے افسانہ سورۂ یٰسیں

احکام پر ترے نہ کرے کیونکہ کام تیر — ہے یہ کمان حلقہ بگوش و غلام تیر
اتنا ہی چست بیٹھے ہے جتنی کماں ہو چست — خوبی کا حق کرے ہے ادا یہاں تمام تیر
ہمسر ہے کس کا تیر ترے تیر سے کہ یہ — انگشت ہے قضا کی کہیں ہیں بنام تیر

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے — دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل — ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے
گھوڑا ہے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ مکاں ہے
ثابت ہے، جو ڈگلا تو نہیں موزوں میں کچھ جان — تیروں میں ہی پر گیری تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غزہ کو صراف سے جا کر — بی بی نے تو کھایا ہے یہ فاقہ سے میاں ہے
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ — شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے — تنخواہ کے پھر ملنے کی یہ شکل کہاں ہے
لیتے ہیں بایں روسیہی وہ تو دو ماہہ — تک دھوس دھڑکے کی جنہیں تاب و تواں ہے
قاضی کی جو سمجھو ہو گدھا باندھ کے اُس میں — بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملّا جو اذاں دیوے تو منہ موند کر اُس کا — کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے
بولا جو خطیب اس میں تو مارے اُسی اک ڈھول — ملعقہ آگیا واعظ تو تھپیڑا بہ وہاں ہے
رینگے ہی گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے — نہ ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے
اور وہ جو ہیں کم زور سو وہاں آن کے بیٹھو — رستے کے جو آگے کو یہ ہر ایک دُکاں ہے
اُٹھ اُٹھ کے دکھاتے ہیں انہیں حال وہ اپنا — دربار رَوا اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے
یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پال کے آگے — اس سج سے رسالہ کا رسالہ ہی دواں ہے
کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک — کوئی روئے ہی منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ہندو و مسلماں کو پھر اُس پال کے اوپر — ارتھی کا تو تم ہے جنازے کا گماں ہے
یہ مسخرگی دیکھ کے وہ صاحب ارتھی — کرتا ہی جو وہاں عرض تو نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے
گو ہو جئے جا کر کسی عہدے کے صاحب — اُس کی تو اذیت بڑی ہی آفتِ جاں ہے
وہ جا کے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو — کیسا ہی اگر اپنے تئیں خوابِ گراں ہے
خمیازہ پہ خمیازہ ہی اور چرت اور چرت — منہ صورتِ سوفار کمر شکلِ کماں ہے
صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر — سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے
صحبت ہے یہ اُس سے اگر آقا کی تئیں چھینک — آوے تو وہ اُس کو بہ خشونت نگراں ہے
دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے — ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے
سوداگری کیجے تو ہے اُس میں یہ مشقت — دھن میں یہ بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث — سمجھے ہے فروشندہ یہ ونڈی کا گماں ہے
گر خان و خوانین کی کرے کوئی وکالت — اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ پہ عیاں ہے
ہر گھر میں وہ جاتا ہے کہیں فوارہ سا چھوٹوں — ہر کوچہ میں جوں آب چکاں ناودواں ہے
شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال — دیکھے جو کوئی فکر و تردد تو یہاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانا — بیت قطعۂ تہنیتِ خانِ زماں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر ۔۔۔ گر رحم میں بیگم کے سُنے نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ اُس کا ۔۔۔ پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے
مُلّائی اگر کیجے تو مُلّا کی ہے یہ قدر ۔۔۔ ہوں دو روپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
دِن کو تو وہ بیچارہ پڑھایا کرے لڑکے ۔۔۔ سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کے ۔۔۔ لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
چاہے جو کوئی شیخ بنے بہرِ فراغت ۔۔۔ چھٹتے ہی تو شعرا کہے وہ مطعونِ زباں ہے
دیتا ہے وُہ خرس سر کوئی شملہ کو نسبت ۔۔۔ گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اُٹھ کر ۔۔۔ ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی ۔۔۔ لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

در ہجو اسپ بخیل

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار ۔۔۔ رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے ۔۔۔ ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے ۔۔۔ موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار
تنہا وے نہ دہر سے عالم خراب ہے ۔۔۔ خستے لئے اکثروں میں اُٹھایا ہے ننگ و عار
ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں ۔۔۔ پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار
نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے ۔۔۔ گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو ایسا خراب و خوار
نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس ۔۔۔ رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا ۔۔۔ ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
ناطاقتی سے اُس کی کہانتک بیاں کروں ۔۔۔ فاقوں کا اُس کے ہائے کہانتک کروں شمار
اُس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اُس کا حال ۔۔۔ کرتا ہے راکب اُس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چار

جس دن سے اُس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گذری ہے اس نمط اُسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار

خط شعاع کو سمجھے ہے وہ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
چرکے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے وہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبرۂ تھاں کی طرف
کھاتا ہے دانہ گھاس کی جاگہ سدا بچار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑے کو دیکھتا ہے تو پادی ہے بار بار

نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اُس کے پیٹ میں
دھونکے ہے اپنی دُم کو کہ جوں کھال کو لُہار

پیدا ہوئی ہے تس پہ اگن پاؤ اس قدر
ہرگز دروغ اس کو تو مت جان زینہار

گذرے وہ جس طرف سے کبھو اُس طرف ستی
باد سموم ہووے صبا گر کرے گذار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سُرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اُس کے رنگ کو مگسی بس اعتبار

یہ حال اُس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کی تو چھڑا اُس کو کردگار

یا مر رہے یا چور لے جاوے یا ہووے گم
اس تین بات سے کوئی بھی ہووے آشکار

تنہا نہ اُس کے غم سے ہے دلتنگ تنگ زیں
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنہوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں اُن کے میں نے کیا جا کے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا تب اُنہوں نے کہ اے میری جان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم اوپر نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانوگے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ
سیرت سے جس کی نت ہے سگ خشگیں کو عار

بدرنگ جیسے لید ہو بدرنگ جوں پشاب
بدہیئت اس قدر کہ کرے اصطبل اجاڑ

مانند میخ چوکی لکڑی سے ہے تھان پہ
لاجنبش وہ بے جگہ نہیں جوں میخ استوار

حشری ہو اس قدر کہ قیامت کو اُس اوپر
دجال منہ کو اپنے سیہ کر کے ہو سوار

اتنا ہی سرنگوں ہو کہ سب اُگ گئی ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلا دے اُسکا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھو زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اُسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اُس کی نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بنا دے کبھی لہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا وہ زینہار

منتہا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار

دلّی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقتِ کار

مدت سے کوڑیوں کو اُڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اُس پہ زین
ہتیار باندھ کر میں ہوا اُس اُوپر سوار

جس شکل سے سوار تھا اُس دن میں اس اُوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی دونوں ہاتھوں میں پکڑی تھا منہ میں باگ
لٹ میخ کے پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبرا اُسے دکھلائے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا جگہ ستی جوں میخ استوار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبران میں سے کہتے تھے یوں پکار

پیچھے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پو سنکے وہ اختیار

کہتا تھا کوئی ہے بڑا کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہیگا ولایت کا یہ حمار

پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار

کہنے لگا یہ آ کے اُس اجماع میں ایک شخص
گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

بھولوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈاین چلے ہے سیر کو ہو جیسے رخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے وہاں دوچار

دھوبی کمہار کی گدھی اُس دن ہوئی تھی گم
اس ماجری کو سُن کیا دونوں نے وہاں گذار

پھر اک نے اُس کو اپنی گدھی کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دُم کمہار

دریائے کشمکش ہوا اُس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبے خفت سے یک کنار

بدبختی اُس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال
لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بیشمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا میں تجھ کو بھی تو چندہ ایتوار

رکھتا کوئی تھا لاکے سپاری کو مُنہ کی بیچ
لیتا تھا کوئی دوڑ کے موتن ستی اُتار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کے گرد و پیش
ساتھ اُس سمند خرس نما کے ہو چشم چار

جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

پہلی ہی گولی چھوٹتے اُس گھوڑی کو لگی
ایسا لگے نہ تیر کہ ہووے نہ تن سے پار

بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب
وہاں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گذار

یہ کہ کے حق ستی میں ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹہ نے ہوا مجھ سے بھی دوچار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اُس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار

جب میں نے دیکھا جنگ کی یہاں تو بندھی تھی گل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

✤

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے درِ دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے لیکن		جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو		مضموں یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا
جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا	ولہ	مرے بھی شیشہ کو اس سنگ میں ٹھکانا تھا
جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا	ولہ	ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا
لطف اے اشک کہ جوں شمع گلا جاتا ہوں		رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہت گل		پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

۲- سوز

سوزؔ تخلص ہے، سید میر نام، ساکن قراول پورہ شاہ جہان آباد۔ سید عالی نسب، اور فن سخنوری میں اُستاد، طرز ادا بندی کے بادشاہ، اور صورتِ مضمون درد و آہ تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے، اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔ شعر کے پڑھنے میں صاحب طرز خاص تھے، اور آئین محبت میں مایۂ مؤدت و اخلاص۔ علم تیر اندازی اور کماں داری میں بہ شدت دل آشنا رکھتے تھے، اور حسنِ شفیعہ نویسی میں نہایت دستِ رسا۔ ابتدائے جوانی میں انہوں نے ساتھ کامِ دل کے ایام زندگانی کو صرفِ نشۂ بے خمار کیا، اور سنہ اٹھارھویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ مزاجی کی تکلیف سے لباسِ فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، اور اوقات ساتھ توکل و قناعت کے بسر کرتے تھے۔

سنہ ۱۲۱۲ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشد آباد تک تشریف لائے، لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اُسی سال پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، اور اس دارِ فنا سے راہی مُلکِ بقا کے ہوئے۔

علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "جس سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں، تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چند فقرۂ نثر لکھ کر مجھے بھجوائے تا کہ داخل تذکرہ کروں" چنانچہ ایک

آوہ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مذکور نے تذکرے میں لکھا ہے۔ ترجمہ اُس کا زبانِ ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے" کہ جو شے حق سبحانہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے، بلکہ جتنے خار و خس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں، اور بندگانِ خدا ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر یہ سوز وہ شخص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے، سواء سکوت اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ! یہ بھی قدرتِ الٰہی کا اظہارِ کمال ہے، کہ ایسی شے خلق کی جاوے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاوے پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اُس کا قابلِ جلانے کے ہے"۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں۔ اشعار منتخب ان کے لکھے جاتے یہاں ہیں۔

وله

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

درد سے محروم ہوں درماں سے مجھ کو کام کیا
یارِ خاطر تھا سو میرا بارِ شاطر ہوگیا

میں نے جانا تھا صحیفہ عشق کا ہے بے نام
واہ یہ دیوان بھی نقلِ دفاتر ہوگیا

کیا مسیحائی ہے تیرے لعل لب میں اے صنم
بات کے کہتے ہی دیکھو سوز شاعر ہوگیا

وله

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دکھ جائیگا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا

قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے
پر مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر بھی کہتا ہوں تجھے "آ سوز کو یوں مت ستا"
مت ستا ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائیگا

وله

مُندی گر چشمِ ظاہر دیدۂ بیدار ہو پیدا
در و دیوار سے شکلِ جمالِ یار ہو پیدا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا کر پڑے گلزار ہو پیدا

یہاں تک کفر پورا چاہئے گر خاک گلشن ہو
بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں، کیا یہ بھی تعجب ہے
کہ میری خاک سے سبزے کی جاگہ خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

وله

جی ناک میں آیا بتِ گلفام نہ آیا
جیتا تو الٰہی مرے کچھ کام نہ آیا

دنیا میں یہی دوستی ہوتی ہے مری جان
جبتک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

عالم کی تمنا میں تری جاں لب آیا — رحمت ہے خدا کی تو لب بام نہ آیا
قاصد سحر تو پوچھا تھا کہ قاصد ہی تو کس کا — وحشت ہے اُسے یاد مرا نام نہ آیا
تھا نزع کی حالت میں یہی سوز کی لب پہ — جی ناک میں آیا، بت گل فام نہ آیا

ولہ
کھڑے رہنے والو مگر سوز ہے یہ — بھلا اس کے دل کا تو ارمان نکلا
مراکشتہ ایسا تو ہے جس کی خاطر — یہ خورشید پھاڑے گریبان نکلا

ولہ
قتل سے یہ بے گنہ راضی ہی اپنے اس لئے — ہاتھ میں اک روز تو داماں قاتل ہوے گا
ابر کے قطرہ سے ہو جاتے ہیں موتی ناصحا — کیا ہمیں رونے سے اپنے کچھ نہ حاصل ہوے گا
درگذر اس خوں سے آخر پھر تجھے آویگا رحم — سوز کا دل جس گھڑی خنجر سے بسمل ہوے گا

ولہ
کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا — جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کرے گا
زلفوں سے پڑا طول ہیں اب عشق کا جھگڑا — خط آن کے یہ مجملہ کو تاہ کرے گا

ولہ
اپنے رونے سے گر اثر ہوتا — قطرۂ اشک بھی گہر ہوتا
جن کے نامے پہنچتے ہیں تجھ تک — کاش میں اُن کا نامہ بر ہوتا
پھر نہ کرتا ستم کسی پہ اگر — حال میرے سے باخبر ہوتا
خون عشاق کرتے کیوں ناحق — گر بتوں کو خدا کا ڈر ہوتا
سوز کو شوق کعبہ جانیکا — ہے بہت پر زیادہ تر ہوتا

ولہ
اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا — تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اُس کے کبھو اپنا — بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
خدایا کس کے ہم بندے کہاں یہ سخت مشکل ہی — رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا
خدا کی بندگی کا سوز ہے دعویٰ تو خلقت کو — ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خودنمائی کا

ولہ
قاضی ہزار طرح کے قصوں میں آسکا — لیکن نہ حسن و عشق کا جھگڑا چکا سکا
قاصد ہو طفل اشک گئے بار ہا ولے — دل کی خبر کوئی نہ تری کو سے لا سکا

کیا فائدہ ہی رونے سے اے چشم زار بس		کب اشک دل کی آگ لگی کو بجھا سکا
رستم نے گو پہاڑ اُٹھایا تو کیا ہوا		اُس کو سراہیے جو ترا ناز اُٹھا سکا
اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث		تو ایک بھی بتا دے کہ واں جا کے آسکا
خطرہ نہیں ہی مجھ کو اے عشق اپنے جی کا	وله	تو نے خطاب بخشا جب سے بہادری کا
ہر صبح مُنہ چڑھے ہی اُس تندخو کے اُٹھکر		کیا آہنی کلیجہ دیکھو ہے آرسی کا
کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سی تو باز آ		دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا
عارض کو تیرے پہنچے کب اُس کی ڈہڈہاہٹ		پیارے ہزار ہو تو ہے گل کا رنگ پھیکا
رستم تو آج تو ہے میدان کے سخن کا		اے سوز کس کو دعویٰ ہی تجھ سی ہمسری کا
تجھ پہ قربان مری جان دل و دیں میرا	وله	ایک باری تو سُن افسانۂ رنگیں میرا
بوئے گل شاخ ہوا میں سی بھی لیتا ہی پہن		کس قدر شوخ ہے اللہ یہ گلچیں میرا
زلفوں کا اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا	وله	یہاں تک تو پریشان یہ دل زار نہ ہوتا
خوگر جو مداوے سے طبیب اپنے کو پایا		تو زیست سے مایوس یہ بیمار نہ ہوتا
گر آنکھ اٹکتی نہ کسی شوخ سے جا کر		تو دل بھی کہیں سوز گرفتار نہ ہوتا
ایک دن اک شخص نے اُس سی کہا	وله	تو نے تو یہ ذکر سُنا ہوئے گا
یعنی کہ عاشق ہے ترا جی سی سوز		ہو متبسم یہ کہا ہوئے گا
بلبل نے جس کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا	وله	دو آنکھ موند ہم نے وہ من ہی من میں دیکھا
خورشید آوے جیسے ابر تنک کے اندر		عاشق کو تیرے جن نے یوں پیرہن میں دیکھا
یوں دیکھنے سے میرے کیا فائدہ کسی کو		دیکھا اُنہیں نے مجھ کو جن نے سخن میں دیکھا
اس سوا کھوج نہ پایا ترے دیوانے کا	وله	قطرۂ خوں ہے مگر خار بیاباں میں لگا
کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا	وله	مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا
نکلنے کا نہیں سینے سے دل جو ڈھونڈے گا		جو نکلے گا تو جلا سا کباب نکلے گا

وله ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا
رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا
جو چھپ کے رات کو شبنم چمن میں روئے تو کیا
مجھے تو ایک سے لے تا ہزار میں رونا
نہ غم خزاں کا مجھے نے بہار کی شادی
خزاں میں خاک ہے سر پہ بہار میں رونا
تو روز وصل تو اے سوز اپنے آنسو پونچھ
ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا

وله بتوں کے عشق سے واللہ کچھ حاصل نہیں ہوتا
اُنھوں سے بات کرنے کو بھی اب تو دل نہیں ہوتا

وله جس نے آدم کے تئیں دم بخشا
اُس نے مجھ کو دلِ پر غم بخشا
ساغرِ عیش دیا اَوروں کو
سوز کو دیدۂ پُر نم بخشا

وله جس نے ہر ذرہ کو درماں بخشا
مجھ سے کافر کو بھی ایماں بخشا
بے نیازی تو میاں کی دیکھو
گل کو بھی چاک گریباں بخشا
چشمِ معشوق کو دی عیاری
سوز کو دیدۂ گریاں بخشا

وله غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو ستا جاؤں گا
پر مری جان ترے غم کو میں کھا جاؤں گا
ہم غریبوں کے گھر آنے کا کہاں تم کو دماغ
مت کرو وعدہ عبث ہم سے کہ آ جاؤں گا
اس طرح جی دوں کہ تو رحم سے بولے صد حیف
رسم عشاق کشی جان اُٹھا جاؤں گا
باغباں فکر نہ کر تو مرے ویرانے کا
آشیاں آتشِ گل سے میں جلا جاؤں گا
لے چکا دل کو خط اب جان جو مانگے ہے خال
سوز کہتا ہے یہ گولی تو بچا جاؤں گا

وله گل ہی ہنسیں غلام تبسم کی آن کا
غنچہ بھی زر خرید ہے تیرے دہان کا
زاہد جو کھینچ کھینچ کے چلّے ہوا ہے خم
بہتر ہے ایسے چلّوں سے چلّہ کمان کا
سینہ میں دل کہاں ہے غم رفتگاں سے سوز
اخگر یہ رہ گیا ہے نشاں کاروان کا

وله جو دل کہ تھا الٰہی اُس دلربا کے گھر سا
خالی پڑا ہے اب یوں اُجڑا ہوا نگر سا
ترسا نے ترس کھایا احوال سُن کے میرا
بے ترس ڈر خدا سے اتنا نہ مجھ کو ترسا
شاید کہ اپنے گھر کی دی اُس نے خاک روبی
خورشید کی کُلہ پر کچھ تو دھرا ہے پرسا

جاتا ہی سوز جس دن کہتا ہی ہمنشیں سے		آنے نہ دیجو اس کو لگتا ہے بد نظر سا
مروت دشمنا غفلت پناہا	ولہ	ادھر ٹک دیکھ لیجو مرتے کے آہا
صرفتُ العمرَ فی لھوٍ ولعبٍ		فآہاً ثم آہاً ثم آہا
یوں دیکھ لے ہی وہ کہ ادا کو نہ ہو خبر		چھینے دل اس طرح کہ دغا کو نہ ہو خبر
عشاق تیری تیغ تلے او ستم پناہ		سر اس طرح سے دیں کہ قضا کو نہ ہو خبر
رخصت جو دی تو مجھ کو تو میں تیرے پاؤں کا		بوسہ لوں اس طرح کہ حنا کو نہ ہو خبر
ناصح تو چاک جیب کا مانع ہی اس قدر		دل چاک یوں کروں کہ قبا کو نہ ہو خبر
اب ضرر کرنے لگا دل کو بتاں کا اختلاط	ولہ	سچ تو ہے ان بے وفاؤں سی کہاں کا اختلاط
اب کوئی دم کو مچاوے گی خزاں یاں آکر دھوم		عندلیبو چھوڑ دو تم گلستاں کا اختلاط
یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا	ولہ	نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سی کچھ باور نہیں آتا
پرائے دل کو لے کر اپنے تلووں کے تلے ملنا		ارے سُن تو تجھے ہرگز خدا کا ڈر نہیں آتا
کسی کے دل میں ہوگا سوز مر جاوے تو بہتر ہے		الٰہی میں مروں کیوں کر مجھے تو مر نہیں آتا
کیا دید کروں میں اس جہاں کا	ولہ	وابستہ ہوں چشم خوں چکاں کا
ہرگز نہ ملا تری گلی سے		ممنون ہوں جسم ناتواں کا
سوز آگے ذرا سنبھل کے جانا		بیٹھا ہے لگائے گھات بانکا
جگر سی آہ دل سی نالہ سینہ سے فغاں نکلا	ولہ	مرے تن سی کیا حسرت زدوں کا کارواں نکلا
جو دل تھا میرے پہلو میں سو اب عرش اعظم ہی		خدا کے واسطے دیکھو کہاں سی جا کہاں نکلا
الٰہی محبت کو لگ جائے لوکا	ولہ	کہ اٹھتا ہے ہر دم جگر سے بھبھوکا
فریب محبت نے مجھ کو پھنسایا		میں بھولا میں بھولا میں چوکا میں چوکا
جہاں روز پریوں کا رہتا اکھاڑا		وہاں اب پڑا ہے گا میدان ہو کا
مرا قتل کیا دلربا نے نہ چاہا	ولہ	وہ کب چوکتا تھا خدا نے نہ چاہا

وله

چشم غفلت کھول کر ٹک دیکھ تو ای مستِ خواب
دہر نے کن کن ملوکوں کا کیا خانہ خراب

مسندِ فرعونیت پر بیٹھتے تھے جو بہ باز ئو
اہلِ استحقاق کا منہ سے نہ دیتے تھے جواب

خاک میں پنہاں ہوئے ایسے کہ کچھ پیدا نہیں
کون سا ان میں ہے رستم کون سا افراسیاب

بارہ ساعت کے لئے افلاک پر ہیں جو دماغ
واہ واہ اُن کو بھی کہہ لو آفتاب اور ماہتاب

پوچھیو تو باندھ کر کس پر چلا ہے تو کمر
میں پڑا کھاتا رہوں گا تا قیامت پیچ وتاب

ان دنوں میں سوز کو دیکھا ہے یارو واہ وا
ایک دنیا دار سے مل کر بنے عالی جناب

وله

اشک کب ہوں تیرے ستانے کی خشک
کوچے کب ہوتے ہیں میخانے کے خشک

چوری چوری منہ ترے شاید لگا
ہونٹ کچھ بیٹھے ہیں پیمانے کی خشک

زلف کی پلٹوں میں کیا جا کر پھنسا
یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک

وله

ٹکرائیں سنگ سے سر ہو ہمکنار ہم تم
روئیں گلے سے لگ کر اے آبشار ہم تم

میرا ہی سرو مجھ سے سرکش ہوا ہے قمری
نالے کریں نہ یک جا ہیں سوگوار ہم تم

دیکھیں تو داغ سینہ کس کے ہیں اے زیادہ
اے لالہ داغ دل کے کرلیں شمار ہم تم

تو میری دل کو دیکھ اور میں تیری دل کو دیکھوں
دل چاک چاک کر کر دیکھیں بہار ہم تم

تم تو چلے گئے پر یہ سوز ہے اکیلا
اے میرے درد صاحب تھے یادگار ہم تم

۳- سجّاد

سجّاد تخلص، میر سجّاد نام، اکبرآبادی۔ وطن بزرگوں کا انکے آذربایجان ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے۔ اور شاگردوں میں شاہ نجم الدین آبرو کے کیفیت طرز ایہام شاہ صاحب مذکور سے زیادہ ہے سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضع کا یہ عزیز بھی اُستاد ہے میر محمد اکرم خاں دادا ان کے دارالانشائے پادشاہی میں نواب یحییٰ خاں میر منشی کے ہمراہ تھے، بہت مرد سنجیدہ اور حقیقت آگاہ تھے۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان پُربیان ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب دیوان ہیں*

ساقی بغیر جام کے جی کا بچاؤ نیں — جوں فیل مست آوے ہی ابر سیہ پلا

ولہ

کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی — مرجا ستم سے اُن کے تو کہتے ہیں حق ہوا

گر تیرے گل کے آنے نے کھوئی نہیں جو اس — سجّاد کیوں پھرے ہی بجن آج فق ہوا

ولہ

یعقوب کے جب عشق پڑا سر یہ ٹوٹ کر — آنکھوں نے اُس کی رو دیا آخر کو پھوٹ کر

عشق میں جائے گا بے طرح مارا — بے طرح دل ہوا ہے آوارا

خط کترواکے آج قینچی سے — ہم سے ملنے میں جائے ہی کترا

غم نہیں گر گم ہوا بالوں میں تیری جا کر دل — پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اُس کو بل دیا

تجھ کو اے سجّاد غیر از خنجر بیداد کے — اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے پھل دیا

بتان تو چاہتے سجّاد تجھ کو — کریں کیا پر خدا نے جو نچاہا

مقبول اس جہاں کا ہرگز غنی نہ دیکھا — راجہ رہی ہی جو کوئی یہاں سے گیا ہی راجہ

ولہ

شتابی پلا لے کہ جاتا ہے ابر — جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب

ولہ

دور میں رخسار کے تیری کہیں انصاف نہیں — خط چرالے جای دل کو اور باندھی جائے زلف

ولہ

جس خوبرو کی دل میں نہ عاشق سی ہو نفاق — کہتے ہیں ساری اُس کے تئیں حسن اتفاق

ولہ

ایک دل رکھتا ہوں جو چاہی سو لیجا وی اُسے — خواہ زلفیں خواہ مژگاں خواہ ابرو خواہ چشم

ولہ

جب ہم آغوش یار ہوتے ہیں — سب مزے در کنار ہوتے ہیں

ولہ

بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے — یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے

اے صنم زنّار پہنی تجھ وفا کے واسطے — ورنہ کوئی کافر بھی ہوتا ہی خدا کیو اسطے

ولہ

کوئی جا کے قاتل کو سمجھائیے گا — کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائیے گا

کہا دل نے بولو یہ خوبوں کے تئیں — یہ دیکھو گے اپنا کیا پائیے گا

ولہ

میرے تمام حال کی تقریر ہے یہ زلف — روز سیاہ و نالۂ شبگیر ہے یہ زلف

ولہ

رہو آہ دل سوز میرے سے فرق — کہ ہے خوشہ چیں اُس کے خرمن کی برق

دل کو کبھی پیار رولا کر کے اے سجن لخت جگر ہمارا پانوں کے ساتھ کھاکر	ولہ	لاگا نہیں گلے سے مرے آج لگ اگر کرتے ہو ہم سے باتیں اب تم چبا چبا کر

باب الشین

۱- شورش

شورش تخلص، میر غلام حسین نام، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر بُہنا کر کے تھے۔ بھانجے تھے ملا میر وحید کے۔ اور مشورہ سخن کا کیا تھا میر باقر حزیں تخلص سے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "میرے آشنا تھے، اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیال فاسد سے انہوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات نہیں کیا ہے، اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ مورد اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے"۔ ایک تذکرا شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انہوں نے لکھا ہے، لیکن وہ بھی بسبب ان کی خود پسندی کے خالی خلل اور زلل سے نہ تھا۔ ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے ہجری میں اس سرائے فنا سے جادہ نورد منزل بقا کے ہوئے۔ دیوان ان کا زبان ریختہ میں مرتب ہے۔ یہ ان کے کلام کا منتخب ہے ✦

ہمارے پاس بھی آیا نہ آیا		بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا
کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام اُٹھی یہ اُلفتِ گل کے سبب سے سب ایذا ہماری صبح رخِ یار شام زلفِ نگار ہر ایک دم میں ہیں وصل ہجر میں موجود رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش	ولہ	قسم مغاں کی ہے ساقی کہ مجھ کو نام سے کام وگرنہ کیا تھا ہمیں ہم صفیر و دام سے کام نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح شام سے کام غرض نہ نام سے رکھتے ہیں نے پیام سے کام ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

باب الصّاد

۱- صانع

صانع تخلص۔ نظام الدین احمد نام۔ ساکن بلگرام۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ محبان قدیم سے میرزا محمد رفیع سودا کے، اور دوستانِ صمیم سے اس خاکسار کے تھے۔ بڑے صاحب درد و تاثیر، اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر جب کسی سے سنتے، تو گھڑیوں روتے، اور بے چین رہتے۔ عالم اخلاص اور دوستی میں زمانہ کے افتخار، استقامت طبع اور رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے۔ سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتے میں ایام زندگی کے بسر کرتے تھے۔ آخر سنہ ھ[1] ہجری میں ملکِ وجود سے رخت سفر کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے۔ فارسی دیوان مترتب ہے ان کا۔ اور ریختہ کا شوق کمتر تھا۔ یہ اشعار اس تذکرہ کو کردار کے ہیں ؎

سجن کی اُس محبت پر دیا تھا جان و دل صانع		نہ تھا معلوم ہو جاوے گا وہ نامہرباں اپنا
جلے بھُنے تِرے جس وقت آہ کرتے ہیں	وله	تو دود و دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں
قسم ہے تیری ہی، کھلنے میں یار تیر نگاہ		جگر تلک نہیں دل کے تباہ کرتے ہیں
وہی ہوئے ہیں تب و تاب جاں ستی آگاہ		جو کوئی دل سے گذر گاہ گاہ کرتے ہیں
خدا بچاوے غم و درد بحرِ عشق میں آہ		ڈبا کے زورقِ دل کو تباہ کرتے ہیں
نہ کوہ کن سے ہوئی بے ستوں میں صانع راہ		بڑے وہ مرد ہیں جو دل میں راہ کرتے ہیں
ہوا ہے شوق مومن کو دھڑی ہونٹوں جمانے کا	وله	نہ جانوں کیا سبب یاقوت کے نیلم بنانے کا

[1] قلمی نسخہ میں سن وفات نہیں لکھا

یہ بلبل شاخ گل پر بیٹھ کر کیا شور کرتی ہے	صبا کا آج وعدہ ہے مگر کلیاں کھلانے کا

بابُ الضاد

۱- ضیا

ضیا تخلص، میر ضیاء الدین نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، میرزا محمد رفیع سودا کے ہم عصر تھے۔ نظم ریختہ میں مالک تھے طبع بلند کے، اور صاحب تھے ذہن ارجمند کے۔ دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے، تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے۔ ایک مدت اوقات اُسی شہر میں بسر کی، اور داد شعر و شاعری کی دی اکثر سخنوروں کو اس دیار کے نسبت شاگردی کی اُس شاعر شیریں کام کے ساتھ ہے، اقسام نظم میں ان سے بیشتر ہوئی فکر غزلیات سے۔ قصیدے سے تو ان کو کچھ انکار سا رہا ہے، اور مثنوی کا خیال بھی کم تر کیا ہے۔ آخر عمر بلدۂ عظیم آباد میں استقامت اختیار کی تھی اور طبیعت اکثر ساتھ عزلت و گوشہ نشینی کے بار کی تھی۔ آشنا پرست اور درد مند، رنج و راحت میں ہمیشہ خورسند تھے۔ از بسکہ مدار دنیائے فانی کا فنا پر ہے راہ گذار جادۂ بقا کے ہوئے۔ مالک دیوان رنگین و متین کے ہیں۔ یہ شعر اس شاعر ذکی و ذہین کے ہیں ؎

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا		آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کُملانے لگا
گل کی رسوائی تجھے کیا بن نہ تھی اے ننگ خلق		اُس کے کوچے میں ضیا پھر آج تو جانے لگا
پلا دے آب خنجر ہم کو ظالم تشنہ جاتے ہیں	ولہ	جو کوئی مرتا ہے اُس کے حلق میں پانی چواتے ہیں
ہے ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں		کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں
ضیا رکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی لے ظالم		کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لوہو سے آتے ہیں
گریاں و خاک اُڑاتا جوں ابر و جوں بگولا	ولہ	صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا کو دیکھا
اے آہ نچ نکل نہ کہیں دل تھلک پڑے		یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

یتیرے ضیا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے
اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے

بابُ العین

۱۔ عزلت

عزلت تخلص، سید عبدالولی نام۔ خلف شاہ سعید اللہ سورتی کے۔ وہ شاہ سعید اللہ کہ سرِ دفتر فاضلان اور سرِ حلقہ صاحبدلان تھے۔ اور بادشاہ عالمگیر کے تئیں اس مرجع خلائق سے اعتقاد صادق تھا۔ اصل وطن شاہ صاحب مذکور کا کوئی قصبہ ہے قصبات لکھنؤ سے، لیکن ازبسکہ اقامت سورت میں اختیار کی تھی سورتی مشہور ہوئے۔ غرض جب عزلت مذکور اپنے والد کی وفات کے بعد دلّی میں آگئے، تو شاہ جہان آباد کے سخنوروں کی ہم صحبتی سے فکر میں ریختہ کے پڑے تلاش پر نظم کی دل دیا، اور حوصلہ شعر و شاعری کا حاصل کیا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "باوصف تمکنت و فضیلت کے اوضاع و اطوار اس عزیز کے خالی سبکی اور بے مغزی سے نہ تھے۔ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور کے عہد دولت میں وارد مرشد آباد کے ہوئے، اور مورد عنایت و امداد کے ہوئے۔ حرکات ان سے خلاف ان کے منصب کے عمل میں آتے تھے اور آنکھوں میں ارباب تمیز کی کیفیت کو اعتبار کی گھٹاتے تھے۔ نواب مرقوم الصدر کی وفات کے بعد سرزمین دکن نور جمال سے اپنے منور کی، اور بقایائے عمر اسی مملکت میں بسر کی۔" دیوان ان کا مدت سے پاچکا انتظام ہے، یہ ان کا منتخب کلام ہے۔

فقیروں سے نہ ہو نیرنگ لالن فصل ہولی میں
ترا جامہ گلابی ہی تو میرا خرقہ بھگواں ہی

ولہ

بہار آئی چمن میں غل ہی بلبل کی صفیروں کا
جدا ہے ہر گلی میں شور زنجیر اسیروں کا

عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا
یہ آئینہ تھا، اُس خود بیں کے آرائش کے کام آتا

جلایا مصحفِ دل تو نے کیوں برقِ تغافل سے
جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

بتوں کا جور دیوانہ دوا کرتا نہیں گا ولہ کہ پتھروں کو وہ صندل دردسر کا جانتا ہیں گا
بگولہ بن کے راہ بے ستوں میں کوہ کن اب تک سُمِ گلگوں کی ماٹی ہاتھ مل مل چھانتا ہیں گا
سیہ روزی میں میری قدر کو احباب جانا نہیں اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیں گا
مجھے چاہے کہ پتھر مارے جب دشنام سکیں گا غلیل ابرو کے غزلت کس مزے سے تانتا ہیں گا
ہوا ہی داغ اُس کا مغز نازک آتش گل سے ولہ چمن زادوں میں اک مرزا منش لالہ ہوا پیدا

جدھر نکلے وہ ہولی باز بانکا ولہ گلابی ہے غبارِ راہ وہاں کا
نخل اُمید بیوفایوں سے ولہ دل سلامت رہے تو پھل پانا
اول ہمیں عشق اپنے سے بیہوش کیا ولہ یاد اپنی دی پھر ہم کو فراموش کیا
ہم نے بھی جرس وار اہی یار سفری دل کو نالاں لبوں کو خاموش کیا

ہماری گرد سے دامن جھٹک گیا دلدار ولہ کلال سا پڑا جلتا ہے اب تلک یہ غبار
یاروں کی خاطروں کی کیا دل مرا خبر لے ولہ ہیں پر غبار سب دل کیا خاک جا خبر لے
جوں شب کہ صبح ہو جائے تب آفتاب آوے ہم جل کے ہو گئے راکھ جب لگ وہ آ خبر لے
ہم ہیں مفلس یار کی قیمت گراں کیا کیجیے ولہ ہم زمین اور اُس کا رتبہ آسماں کیا کیجیے
بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا ولہ کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے
تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں ولہ تجھ آنکھوں کے ساغر کا میخوار میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم کہ آنکھوں سے تیرا خریدار میں ہوں
پیر ہو یا شیخ ہو ہے دیکھو طفلاں کا مرید ولہ مردہ بولا ہے کفن پھاڑ قیامت آئی
دل میں رندوں کے پھپولا ہوا عمامۂ شیخ ولہ یا رب اس بزم سے یہ زہر کا ٹکڑا جاوے
کھلا کے دل جسے پالا سو ہے مرا والی ولہ جناب پاک جنوں مدظلہ العالی
شانہ اُس زلف میں پھرتے یہ سخن کہتا تھا ولہ بات کہتے ہی شب وصل چلی جاتی ہے
شکستہ گر ہوا دل اب نظر نہ کر مجھ کر یہ ٹوٹے آئینے میں منہ تری بلا دیکھے

۲- عشق

عشق تخلص، شاہ رکن الدین نام۔ شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے۔ شاہ جہاں آبادی۔ نواسے شاہ فرہاد کے عمدہ مشایخوں میں سے ولی گے۔ جہاں بیان ہوئی۔ شاہ فرہاد کی حالت سکر و مستی ہے، تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ کی نہیں کی ہے۔ غرض عشق مذکور ایام شباب میں شاہ جہان آباد سے مرشد آباد میں آئے، اور خواجہ محمدی خاں مرحوم کے ساتھ لباس دنیا داری میں ایک مدت ایام حیات بعزت تمام بسر لائے۔ اگرچہ نہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے، لیکن آنکھوں میں امرایان مرشد آباد کے نہایت احترام رکھتے تھے۔ بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگوں کے طور پر مزاج فقر و درویشی کی طرف آیا، اور تکیہ فضل ایزدی پر کر کے طور استقامت کا عظیم آباد میں ٹھہرایا۔ پھر تو نہایت زور و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی، اور معتقدوں کے ہجوم سے عالم درویشی میں شاہی کی۔ طالبان راہ عشق کو ہدایت مطلب سے خالی نہیں چھوڑا۔ بقول علی ابراہیم خاں مرحوم ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے ہجری تک داد حال و قال کی دی۔ آخر بلدہ عظیم آباد میں مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک اجابت بآواز بلند کہی۔ دیوان اس مشیخت دستگاہ کا زبان ریختہ میں مترتب ہے، یہ اس کا منتخب ہے۔

کہنے کو اِدھر اُدھر گئے ہم تا جاں نہ ہوئی عدول حکمی		تھے تیری طرف جدھر گئے ہم تو نے کہا مر، تو مر گئے ہم
بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں	ولہ	عشق رخصت دے تو شور حشر برپا کروں
نے دردِ دل ہے باقی نے آہ و نے فغاں ہے	ولہ	اے سوز عشق سچ کہ توان دونوں کہاں ہے
دیکھے بن اُس کے یک دم چین یہ رہتا نہیں	ولہ	اس دل کافر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم
جوں آفتاب تاباں گو نام کو بیاں ہوں	ولہ	یہ پرتو ہے تیرا ٹک دیکھ میں کہاں ہوں
گو نام اور نشاں ہے ظاہر میں میرا یارو		جو دیکھو فی الحقیقت ہوں وہم یا گماں ہوں
باتیں نہ سن تو میری جل جائے گا دیوانے		میں برق آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

ولہ

عرش تا فرش سیر کر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
چشمِ تحقیق سے جہاں ڈھونڈھا — کافر ہوں تجھ سوا اگر دیکھا
تیر کے نام پر تڑپتا ہوں — اس طرح کا کہیں جگر دیکھا
آبلہ آبلہ ہوئے سب عضو — نخلِ اُلفت میں یہ ثمر دیکھا
سحر میں سامری کے کیا قدرت — تیری نظروں میں جو اثر دیکھا
اپنے ہم چشم سے لگا کہنے — نالہ و آہ گھر بہ گھر دیکھا
ٹک اک انصاف سے اگر دیکھو — عشق سا کوئی چشم تر دیکھا

ولہ

دیدۂ دل جو کر کے وا دیکھا — حرم و دیر میں خدا دیکھا
ہنس کے کہنے لگا ملامت کر — عشق میں تو نے کیا مزا دیکھا
اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے — اُس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا
دشت تجھ کو قسم ہے مجنوں کی — عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا

ولہ

از عدم تا وجود آ دیکھا — جان دیکھا سو بے وفا دیکھا
اپنی آنکھوں سے دیکھ اے خوش چشم — مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا
تجھ سے کوئی آشنا نہ ہوا ہو — پر تجھے سب سے آشنا دیکھا
اُس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم — خاک میں آپ کو ملا دیکھا
ظالم اپنی جفا میں کہ تو کبھو — لب مرا شکوہ میں ہلا دیکھا
کبھو غم سے جدا نہ دیکھا میں — عشق کو جا کے بارہا دیکھا

ولہ

میں کافر ہوں اگر منظور ہووے لطف مرہم کا — کہ یہ داغ جگر ہے یادگار اُس یار ہمدم کا
ترا یہ وعدۂ فردا تو دل کو روز فردا ہے — کہاں فرصت ہے اے ناداں بھروسا ہی کہاں دم کا
رُلانے میں مرے کچھ تجھ کو ہیگا فائدہ کہ تو — مگر اتنا کہ گھر اپنا ڈبویا اور مردم کا
کفایت ہے بروزِ حشر مجھ کو شفقتِ حیدر — کہ جس کے نام سے زہرا ہوا پانی جہنم کا

چاکِ دل تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا بے وفائی تری دل دیکھ کے اور وعدہ خلاف	دل	لختِ دل زینت داماں نہ ہوا تھا سو ہوا عشق بازی میں پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

۳- عیش

عیش تخلص، میرزا عسکری نام، بیٹے مرزا علی نقی کے۔ وہ مرزا علی نقی جن کو نواب حسین قلی خاں کی طرف سے اپنی جہانگیر کی ایک مدت رہی، اور زندگی اُنھوں نے اس خدمت میں نہایت تشخیص وحکایت کے ساتھ بسر کی ہے۔ غرض میرزا عسکری مذکور جوان مودب و باشعور اور تہذیب اخلاق سے معمور ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ میرے آشنا ہیں، بہت ہی باشرم وباحیا ہیں۔ وطن تو ان کا شاہ جہان آباد ہے، لیکن ایک مدّت سے مرشد آباد میں آکر رہے تھے، اور بعضے خدمتوں کے ساتھ سرکار میں ناظم بنگالہ کے اوقات بسر کرتے تھے۔ دیوان ان کا مورد اشتہار ہے، یہ اُن کا خلاصۂ افکار ہے +

وہ اگر آوے سر بام کہیں	میں بھی کرلوں اُسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ، دے ساقی	ایک باری تو بھر کے جام کہیں
اس شب وصل کی سحر اسے چرخ	لیجو مت مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش سے ہے تصدق سونر	مجھ سے ہوتی تھی انصرام کہیں

باب الفاء

۱- فقیر

فقیر تخلص، میر شمس الدین نام، متوطن شاہ جہان آباد کے۔ اُستادوں میں سے شعرائے ہندوستان کے تھے۔ اہل ہند میں مجال کسی کی نہ ہوئی کہ سخن گستری میں مقام فیضی کے، اور خوش بیانی میں جگہ پر ان کے تکیہ کرسکے۔ دار الخلافہ شاہ جہان آباد میں ہر روز زندگانی کا انھوں نے

نہایت غربت اور استغنا کے ساتھ بسر کیا ہے، اور اس عرصہ میں دکن کا بھی سفر کیا ہے۔ چنانچہ بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔ اقسام نظم میں کوئی قسم نہیں رہی کہ ان کے خامۂ سحر آفرین نے اُس میں جادو کاری نہیں کی، اور انواع شعر میں کوئی نوع نہیں چھوٹی کہ ان کے کلک گوہر سلک سے اُس میں دُر وباری نہیں ہوئی۔ اکثر علوم میں کتابیں انکی تصانیف سے ہیں۔ خصوصاً عروض و قوافی میں کیا خوب رسالے تالیف کئے ہیں۔ سنہ ۱۱۱۷ھ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے، اور بعد حصول سعادتِ زیارت کے جب کہ پھرے تو کشتیِ حیات اُس آشنائے بحر معنی کے گرداب ممات میں تباہی ہو کر ڈوبی یعنی اس ناخدائے جہاز سخندانی کے جہاز کو باد مخالف نے صدمۂ طوفان دیا، اور دریائے سقط میں غریق بحر رحمت کیا۔ اگرچہ کہنا ریختہ کا اُس اہل کمال کا دون مرتبہ کمال تھا، لیکن اکثر واسطے تفنن طبیعت کے اس کا بھی اشتغال تھا۔ یہ گوہر آبدار اس بحر سخن سنجی کے آویزۂ گوش روزگار ہیں

دردمندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

ہے غرض دید سے یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ ادھر بیٹھ گئے خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
لاکھ دیوار گرے سیکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظر ناز نے اُس باز کو بخشی پرواز
سیکڑوں مرغ ہوا پھاند[1] کے پر بیٹھ گئے

کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی
نالہ کرنے سے گلے اُن کے مگر بیٹھ گئے

مفت اُٹھنے کے نہیں یار کی کوچہ سے فقیر
جب کہ بستر کو جما کھول کمر بیٹھ گئے

ولہ

آہ تو نے تو کئی بار ہلایا ہے فلک
زیادہ گستاخ نہ ہو عرش کو پہنچے گی دھمک

کل ہی کی شب کا ہے مذکور کہ جبریل آئے
خوب معلوم نہیں آپ تھا یا اور ملک

[1] آج کل باندھ بولتے ہیں ۰

۲- فغاں

فغاں تخلص، اشرف علی خاں نام تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ خلف میرزا علی خاں نکتہ کے۔ آٹھ پہران کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا۔ کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، اور مربی گری سے ظرافت کی ندیم تھے جہاں پناہ کے۔ چنانچہ ظریف الملک کوکے خاں بہادر حضور سے بادشاہ کے خطاب پایا تھا۔ اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا۔ دِلّی سے مرشد آباد میں اپنے چچا کے پاس، کہ محمد ایرج خاں کر کے مشہور تھے، وارد ہوئے۔ لیکن نہ رہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر شاہ جہان آباد چلے گئے۔ بعد کئی برس کے عظیم آباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہاں ٹھیرائے رفاقت میں مہاراجہ شتاب رائے کے چند مدت اوقات کاٹے، اور لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ہی میں دن رات کاٹے۔ اتفاقِ اصلاحِ سخن ان کو شیخ علی قلی ندیم تخلص سے ہوا ہے۔ نظم ریختہ میں طبیعت ان کی رسا ہے۔ بسنہ ۱۱۸۶ گیارہ سو چھیاسی ہجری میں اس حباب کو دریائے فنا کے نزاٹھا سمجھ کر آشنائے بحرِ بے کنارِ بقا کے ہوئے۔ بلدہ عظیم آباد اُس شیریں کلام کا مدفن ہے، اور تلخی روزِ حشر تک اب وہیں مسکن ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، غزلیں منتخب ان کے دیوان کی لکھی گئی یہاں ہیں۔

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشک سرخ کا		تیری کسب نے آستیں مری لہو سے بھر گئی
ہستی کے خرابے نظر آتے جو عدم میں	ولہ	ہرگز کوئی اس خواب سے بیدار نہ ہوتا
اے شیخ اگر کفر سے اسلام جدا ہے		پس چاہیے تسبیح میں زنّار نہ ہوتا
مجھے تو تعزیہ دار اپنا کر گئے اپنے	ولہ	کہ جو شفیق تھے وہ دوست مر گئے اپنے
عبث تو تڑپے ہے کنج قفس میں مرغ چمن		اسی تڑپ میں تو یہ بال و پر گئے اپنے
مرا مقام ہے اس سرزمیں پہ عاریتاً		اُدھر کو جانا ہے آخر جدھر گئے اپنے
کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے فغاں تنہا		کہ اس سفر کے مسافر تو گھر گئے اپنے
شب فراق نہ تنہا مجھے رُلاتی ہے	ولہ	یہ صبح وصل بھی آنسو سے منہ دُھلاتی ہے

اگر میری زباں پر بار دیگر انتظار آوے	وله	ابھی رونے پہ ظالم دل مرا بے اختیار آوے
دل زلف میں الجھا مجھے آرام یہی ہے	وله	میں صید بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے
تار کی طرح کہیں زلف بتاں سے ٹوٹے	وله	یا الٰہی دل بیمار بلا سے چھوٹے
ضعیف سے دل بیمار اس قرینے سے	وله	اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے
عشاق تیری گرمی بازار کر گئے	وله	اس جنس کو گراں یہ خریدار کر گئے
اُٹھ چکا دل مرا زمانے سے	وله	اُڑ گیا مرغ آشیانے سے
دیکھ کر دل کو مڑ گئی مژگاں		تیر خالی پڑا نشانے سے
ہم نے پایا تو یہ ستم پایا		اس خدائی کے کارخانے سے
غیر از دوئی کے مانع دیدار کون ہے	وله	وہ یار ہو گیا تو پھر اغیار کون ہے
بیم غضب رکھے ہے مجھے مغفرت سے دور		گر وہ کریم ہے تو گنہگار کون ہے
جاگا نہ کوئی خواب عدم سے کہ پوچھتے		آسودگانِ خاک میں بیدار کون ہے
میں مرگیا پہ آہ نہ پوچھا فغاں مجھے		درد جگر کسے ہے یہ بیمار کون ہے

۳۔ فرحت

فرحت تخلص شیخ فرحت اللہ نام۔ بیٹا شیخ اسد اللہ کا۔ اولاد سے قاضی مظہر کے، وہ قاضی مظہر کہ جانشین مرزا شاہ بدیع الدین مدار کے تھے۔ وطن بزرگوں کا ان کے ماوراء النہر ہے لیکن فرحت مذکور نے دِلّی میں پرورش پائی ہے، اور عاشق مزاجی و دل بستگی ہی میں عمر گنوائی ہے۔ ہمیشہ بند عشق میں مسلسل مویوں کے گرفتار، اور سدا درد عشق سے بیگانہ خوبوں کے یار۔ شاعر کہن مشق و ہم صحبت شعراء نامدار شاہ جہان آباد۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ عزیز مبتلا اخلاص مند تھا، اور عسرت کا مورد گزند تھا۔ جب کہ دلّی سے مرشد آباد میں آیا، اور طور سکونت کا وہاں ٹھہرایا، جو مجھ سے ہو سکتا تھا خبر گیران حال گاہ گاہ ہوتا تھا۔ غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ عزیز

کا نباہ ہوتا تھا۔ آخرالامر ۱۱۹۱ھ گیارہ سو اکانوے ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا، اور اس دارِ محن سے، خلاف اپنے تخلص کے بہت مغموم گیا۔ زبان ریختہ میں اُس نے بہت کچھ کہا ہے، یہ منتخب اُس کے دیوان کا ہے ٭

گذرے اگر چمن میں وہ گلعذار اپنا	دیں چھوڑ بے کلی سے گل شاخسار اپنا
تاثیر آہ میں نے نالے میں ہے اگر کچھ	ہووے وہ آہ یارب کس طرح یار اپنا
جاوے کہیں بھڑک بہت آتش سے دل کی میرے	رکھ دور مجھ سے دامن اے کوہسار اپنا
اُس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے گل کو تو نے	اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا
آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم	ہرگز نہیں ہے دل پر کچھ اختیار اپنا

۴۔ فدوی

فدوی تخلص، میرزا محمد علی نام، معروف میرزا بچو، متوطن تھے اُس اُجڑے نگر کے جو کہ مشہور شاہ جہان آباد، کر کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد ہے۔ تلاشِ معنی میں فکر رسا رکھتے تھے، اور بیان حسن میں دل درد آشنا۔ علم موسیقی ہندی میں مناسبت بہت درست، اور تان کی سستی اور چستی کے جاننے میں نہایت چالاک و چست۔ چند روز انہوں نے اوقات مرشد آباد میں بسر کی ہے، لیکن اس سیر و تماشے کے ساتھ جو کہ وضع اہل نظر کی ہے۔ آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا تو وضیع و شریف اس شہر کا ان کا مشتاق ہوا۔ فدویت میں معارف آگاہ شاہ گھسیٹا کے حاضر رہتے تھے، اور فیض صحبت سے اُس عرفان پناہ کے کسب علوم ظاہری اور باطنی کا کرتے تھے چنانچہ اُسی شہر میں اس کہن رباط مسافر کش ہستی سے دل اُٹھایا، اور ایوانِ مہمان دوست عدم میں اسباب سکونت کا بھجوایا۔ زبان ریختہ میں شاعر شیریں بیان ہے، یہ اُس کا منتخب دیوان ہے ٭

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گذرنا	مت بھول کے ہرگز مع اغیار گذرنا
ایسا نہ ہو رندوں کی کرک ہو کہیں منڈیل	میخانے سے اے شیخ خبردار گذرنا

ضد دیکھیو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر — مر جائے جو عاشق تو نہ زنہار گذرنا

اُس بو کے تصدق ہیں کہ اُس گل کی گلی سے — ہے بادِ صبا کے تئیں سو بار گذرنا

کل یار کے کوچہ کی طرف گذریگا فدوی — مت آج سے تو اُس طرف اغیار گذرنا

وله

ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گذرنا — پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گذرنا

تجھ کو نہیں آنکھوں کی قسم تیر نگہ سے — ٹک دل کو بچا سینے کے تو پار گذرنا

جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا — اے اشک تو ہو قافلہ سالار گذرنا

گر ننگ و حیا تم نہیں جاتے تو نہ جاؤ — ہے مجھ کو تو اس کوچہ سے لاچار گذرنا

شاید نظر آجائے کبھو در پہ تو سو بار — فدوی کے تئیں ہو پسِ دیوار گذرنا

وله

وہ کافر ہماری شب تار ہے — جسے دیکھنا مہر کا عار ہے

باب القاف

۱- قایم

قایم تخلص، شیخ محمد قایم نام متوطن چاندپور ندبینہ [غالباً صحیح نام نگینہ ہے] کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد مسلم الثبوت تھے۔ ساتھ طبعِ بلند اور ذہنِ رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے شق میں مشورہ سخن کا انہوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا ہے، اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفرین کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اُس شیریں مقال کے، اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اُس نازک خیال کے۔ صفائے بندش سے اُس کی آئینہ کو طلب صفائی دام اور خجالت سے اُس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اُس نظم صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی، اور موجزنی اُس طبع معنی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص کا

اس جہان فانی سے اُٹھ جانا، اور داغِ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلانا۔ اُس عندلیب شاخسار سحر بیانی نے شاید سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں، اُدھر ہی نواح وطن میں اپنے، اس دار فانی سے سیر عالم باقی کی کی، اور عجب طرح کی ایذا جان کو اہل معنی کے دی۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اُس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے، لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے، یہ ان کے منتخب افکار سے ہے۔

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا		اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
درد دل کچھ کہا نہیں جاتا	وله	آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم		کیا کروں پر رہا نہیں جاتا
یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام اسی کا	وله	پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا
قائمؔ خوباں کی طرف رکھنی کا بندہ ہوں میں		ملتے ہیں کہیں نام ہے بدنام کسی کا
بنی بھوؤں سی ڈرا چاہیئے کہ کہتے ہیں	وله	کرے ہے کاٹ سروہی سے بیشتر اونا
جب تک کہ ہے تو ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ	وله	جوں موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا
عہدہ سے اُس صنم کے بر آیا نہ جائے گا	وله	یہ ناز ہے تو ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا
کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ		کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا	وله	ہچکی گر آئے تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا
کہاں ہے شیشۂ محتسب خدا سے ڈر	وله	مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا
دل پا کے اُس کی زلف میں آرام رہ گیا	وله	درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا
میں اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا	وله	لے دل میں اپنے حسرت سرو چمن گیا
شیریں تو ساتھ خسرو کے کر ذوق سے معاش		پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا
ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر		روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی میں اور آپ ہی من گیا
روؤں گا زیر سایہ دیوار بیٹھ کر		جس دن تری گلی میں کوئی داؤں بن گیا

ولہ
زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات — ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات
خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے — ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل — دل گرا شاید اضطراب میں رات

ولہ
بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر — ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر

ولہ
بے شغل نہ زندگی بسر کر — گر اشک نہیں تو آہ سر کر
کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی — اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

ولہ
کیوں کیا مجھ کو تو صیاد گرفتار قفس — میں نہ شائستہ بسمل نہ سزاوار قفس

ولہ
جب موج پر اپنی آگئی چشم — دریا دریا بہا گئی چشم

ولہ
اب کے جو یہاں سے جائینگے ہم — پھر تجھ کو نہ مُنہ دکھائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم — جب گالیاں نت کی کھائینگے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں — اس عہد سے کب بر آئیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا — ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
جوں چاہیئے چاہ کا سر رشتہ — قایم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

ولہ
نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا ہے آنکھوں میں — کبھی روئے تھے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے — حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں

ولہ
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات — ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

ولہ
نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں — یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں

ولہ
جب اُسے غیر سے ہو نین کھلانے کا شوق — سرمہ کے واسطے بھیجے ہے صفہان مجھ کو

ولہ
راہ کے بیچ جو رکھتا ہوں اُسے گھیر کبھو — ہنس کے کہتا ہے کہ اب چھوڑ مجھے پھیر کبھو

ولہ
اتنی اے دیدۂ و دل مجھ پہ نہ بیداد کرو — دیکھیں کیا ہووے خدا کو تو ٹک اک یاد کرو

ولہ
کبھی دکھا کے کمر اور کبھی دہاں مجھ کو — نپٹ تنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تو اپنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر — بنسٹ ہے سایۂ دیوار گلستاں مجھ کو

ولہ
جو کہ چُہلیں تھیں سو ہانے گئیں وہ یار کو ساتھ — سر پٹکنا ہی پڑا اب درو دیوار کے ساتھ
ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے — بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ
میں ہوں دیوانہ سدا کا نہ مجھے قید کرو — جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

ولہ
تھی شرط مجھے اُس سے تو اک رات بسے کی — کیا ہے کہ دل اُس زلف سے ہرگز نہ بھر آیا

ولہ
تیغ چڑھ اُس کی سان پر آئی — دیکھیں کس کس کی جان پر آئی

ولہ
دہن کو تیرے پایا بات کہتے — ہماری جزرسی میں کیا سخن ہے

ولہ
دل ڈھونڈھتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے — یاں راکھ کا اک ڈھیر اور اک آگ دبی ہے

ولہ
میں جاتا ہوں کعبہ سے اب دیر کو — بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے

ولہ
مُردنِ دشوار میں یہ حال بے تقصیر ہے — حسرتِ دل سو طرف سے اُس کی دامنگیر ہے
قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل — غرق آبِ شرم میں اب تک دمِ شمشیر ہے

ولہ
مر جائیے کسی سے پہ اُلفت نہ کیجئے — جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

ولہ
مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے — جو گذرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

ولہ
یاس ہیں تجھ غم کے میں اپنی بھی غم خواری نہ کی — دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی
دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ — دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی
بعد خط آنے کے اُس سے تھا وفا کا احتمال — لیک وہاں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

ولہ
دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے — شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے
گندمی رنگ جو ہے دنیا میں — میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے
ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے

ولہ
گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

ولہ
زاہد درِ مسجد پہ خرابات کی تو نے — جی بھی چاہے تھا کرامات کی تو نے

ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر نعلایں
اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے

ولہ

مراجی تجھ کو کیا پیارا نہیں ہے
پر اتنا بھی تو ناکارہ نہیں ہے

ولہ

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قایم
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے۔

ولہ

کیا ہی مکھڑا ہے یہ کہ جس کے حضور
آئینہ کی قلعی اُدھڑتی ہے
قایم آیا ہے پھر وہ بن ٹھن کر
دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

رباعی

کیا ظلم ہے دنیا کہ یہ ارباب نعیم
بے قرب کریں ہم کو دکھا کر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ
محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

مثنوی بردیہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبز وہ شال کی رضائی ہے
دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات
کالی کمل میں رات کاٹے ہے رات
چرخ کی اطلسی قبا ہے ہمیش
نہیں یہ کہکشاں ہے دانا کیش
ندی پر آکے بیٹھے جو بگلا
پروں سے اپنا اوڑھے ہے وہ گلا
برف کوچوں میں یوں پڑی ہے صاف
جوں کہ اُڑتا ہے پنبۂ نداف
کہرے کو دیکھ کہتے تھے سب یار
ٹھنڈی سی ہے فلک کے جی میں غبار
پر جو دیکھا ہے غور کریں آپ
نکلے ہے منہ سے آسماں کی بھاپ
باد چلتی ہے بسکہ تند و سخت
روز و شب کانپتے رہے ہیں درخت
گرچہ سرما سے خاص و عام ہیں شل
پر کہوں کیا میں حال اہل دول
لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور
جس طرح ناشپاتی و انگور

جا کے حلوائی کو جو دیکھو کہیں برفی چھٹ کچھ دکاں میں اُس کے نہیں
قایم اب سردی کا ہے یہ مذکور شعر ہو گر خنک تو رکھ معذور

مخمس

شیخ تو نابود ہووے یا ترا پندار نیست بتکدہ ویراں ہوں یا ہوں برہمن یکبار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں راہب و دیندار نیست کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

عاشقوں کے رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دھن دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل جو جی چاہے تو چن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کر آیہ بات سن ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن
نسبتِ باریدگی وارد ولے خونبار نیست

رباعی

دیکھ حال مرا اُٹھا کے سو سو حیلے ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کفش میں نہ چھوڑوں گی قدم سو اُس کے بھی ہو چکے ہیں کتنے ڈھیلے

۲۔ قدرت

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ نام۔ ساکن شاہجہان آباد کے۔ مشہور سخنوروں میں سے تھے رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیر کے۔ صاحب مذاق تھے چاشنیِ درد و تاثیر کے نظم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے۔ خاطرِ سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے۔ طرز مضمون آفرینی سے ماہر، اور راک فشستگی و برجستگی کلام سے اُن کے ظاہر۔ اکثر فکر اشعار فارسی کی بھی کرتے تھے، لیکن نظم ریختہ پر مرتے تھے۔ تازہ کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز، اور صفائی میں بندش کی نازک خیالوں سے ہند کے دمساز تھے۔ وارستہ مزاجی کے یار، اور آزادہ حالی سے سروکار۔ ایک مدت سے دلی کو چھوڑا تھا، ۱۰: وارد مرشد آباد تھے، اکابر اور اعزہ اُس شہر کے سب ان سے بر سر عنایت و امداد تھے۔ علی ابراہیم

خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "مجھ سے ان کو اخلاص اور اتحاد تھا۔ واقعی عزیز اپنے طور کا اُستاد تھا۔ شاید ۱۲۰۵ء سنہ بارہ سو پانچ ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا۔ اور طبع کو صاحب طبعوں کے حد سے زیادہ پر ملال کیا" دیوان میں اُس صاحب قدرت کے ہر قسم کے اشعار ہیں۔ یہ غزلیں انکی منتخب افکار ہیں ٭

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا — اے بادہ کشاں مژدہ کہ پھر ابر تر آیا

کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے — شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا

غفلت میں کٹی شام جوانی تری صد حیف — پیری میں تو ٹک چونک کہ وقت سحر آیا

ولہ

ترے حضور میں جب قصدِ عرضِ حال کیا — ہجومِ گریہ نے میری زباں کو لال کیا

میں داغ تازہ میں تو ڑے یہاں تلک ناخن — کہ ایک بدر کا کاسہ پر از ہلال کیا

ہوا ہے اُس کے گلو میں گرہ دمِ اعجاز — ترے لبوں نے مسیحا سے کیا سوال کیا

ولہ

ٹوٹی کمند بخت کا وہ زور رہ گیا — جب بام دوست ہاتھ سے کچھ دور رہ گیا

اوپر سے زخم گرچہ بھرے ہو چلے ولے — ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

ولہ

مدتوں سے رخنۂ دل یہاں جو منت مسدود تھا — یک ذرا کھولا تو دیکھا خانۂ پُر دود تھا

کبریائی کا جو دیکھا میں نے جس جا پر ظہور — اپنی اپنی حد میں جو پشّہ تھا اک نمرود تھا

حالِ قدرت پوچھا ہی کچھ تو ظالم مجھ سے سُن — اُس کے بالیں پر دعا کو آج ہی موجود تھا

آہ جو اُٹھتی تھی درد دل سے تھی لپٹی ہوئی — اشک جو گرتا تھا سو لختِ جگر آلود تھا

ولہ

بیتابیوں سے یہ دلِ بیتاب رہ گیا — اپنی طپش میں جل کے یہ سیماب رہ گیا

آنسو تھمے ہیں پر نہیں سوکھی ہے چشم تر — دریا اُتر گیا ہے یہ گرداب رہ گیا

ولہ

ہم پہ ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا — یار گھر جانے لگا ای وائے گھر جانے لگا

جب مسیحا دشمنِ جاں ہوں تو کب ہے زندگی — کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا

مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی — آہ جب جاتے رہے دن تب یہ پچھتانے لگا

کب تلک اے نالہ زیرِ لب رہیں گا تو گرہ		حوصلہ باقی نہیں بس جی تو گھبرانے لگا
دل سدا سینہ میں جلتا ہی رہا	وله	لختِ دل آنکھوں سے ڈھلتا ہی رہا
تو نے گو مجھ کو دلاسے میں رکھا		جی مرا تو بھی تو گھلتا ہی رہا
دل ہوا اسیر زلفِ سیہ فام رہ گیا	وله	صیدِ ضعیف مر کے تہِ دام رہ گیا
جب دیکھتا ہے مجھ کو تو دیتا ہے گالیاں		اپنے نصیب کا یہ اک انعام رہ گیا
آگے نہ چل سکا تری کوچے کو چھوڑ کر		خورشید جا کے تا بہ لبِ بام رہ گیا
قدرت کس آس کے یہ کٹے گی یہ زندگی		آنے سے اب تو نام و پیغام رہ گیا
آتش فروز دل ہے تا حسن شعلہ رو کا	وله	ہر اشک ہے شرارہ ہر آہ ہے بھبوکا
ڈھونڈھے ہے پاس اب کیا سینہ میں غمزدوں کے		مدت سے لٹ چکا یہاں سامان آرزو کا
کشتہ ہوں جان و دل تیرے خدنگ کا میں		بجر کہاں ہیں ہیگا پیاسا مرے لہو کا
تشنہ لب مرتا ہے نت موجِ دمِ شمشیر کا	وله	اے غرور ناز کچھ بھی فکر اس نخچیر کا
خواب غفلت لگ گئی تھی ان دنوں دل کو ابھی		آہ پھر کس نے یہ چھیڑا سلسلہ زنجیر کا
رنگِ خونِ تشنگاں جس جا سے اڑ سکتا نہیں	وله	ہوں اسیر ناتواں اس خاکِ دامنگیر کا
گھر سے جس وقت وہ غارتگرِ ایماں نکلا	وله	کفر سے کیا گیا دیں سے مسلماں نکلا
وہ دل جمع کر اٹھا جو بغل سے اپنی		تو بزیرِ شکنِ زلف پریشاں نکلا
اس چشم سے ہو کے آب نکلا	وله	سینہ سے دلِ خراب نکلا
جو نالہ جگر سے پار نکلا		لے سیخ پر اک کباب نکلا
خط آیا وے ہمارے خط کا		منہ سے نہ ترے جواب نکلا
بیت الحزن میں شب کہ ترا انتظار تھا	وله	کھٹکا ہر ایک دل کا مرے جی کے پار تھا
ادھر بھی ایک بار جفا کی عناں کو پھیر		دل ہے خدنگ دوست جگر ہے سناں طلب
دست بردِ ظلم سے تیرے ہیں جتنے ہم خراب	وله	اس قدر بھی ہووے گا عالم میں کوئی کم خراب

زخم سے دل کے ابھی اے چارہ گر بہتا ہے خوں		مت ڈبو بے فائدہ پھائے نہ کر مرہم خراب
گھڑے رونا گھڑے سر کو پٹکنا	وله	خوشا ایام و اوقات محبت
ہرزہ گردی سے رہائی کے چھُٹا	وله	پھر مجھے زنداں میں اسے زنجیر کھینچ
جان ہے وابستہ اُس پیکاں کے ساتھ		میرے پہلو سے نہ اپنا تیر کھینچ
ذرا قفس سے قفس تو ملا کے رکھ صیاد	وله	کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد
جہاں نظر پڑے پاؤں تلے ملے کاغذ	وله	سمجھ کے نامہ مرا ہاتھ میں نہ لے کاغذ
میں کیونکہ اُس کو لکھوں خط جب اشک و آہ سے یہاں		اودھر چلے قدم اور اُس طرف گلے کاغذ
کسے جز خون دل میخانہ میں منظور ہے ساغر	وله	مری آنکھوں میں تجھ بن دیدۂ ناسور ہے ساغر
آہ رو سے پاک تیرا کس طرح آوے نظر	وله	لخت دل جب چھا رہا ہو دیدۂ نمناک پر
یہ دل شوریدہ جیسے ساتھ ہے زیر زمیں		شور محشر ہی رہا قدرت کی مشت خاک کو
تجلی جلوہ چاہے تو صفائی سینہ پیدا کر	وله	اگر دیدار کا طالب ہے، تو آئینہ پیدا کر
ہے نالۂ شام، آتش و آہ سحر آتش	وله	کیا زیست ہو اپنی اِدھر آتش اُدھر آتش
جز داغ تدارک نہیں اس داغ جگر کا		آتش کے جلے کو نہ کرے یہ جگر آتش
پھاہے کو اگر داغ سے چھاتی کے چھڑا دوں		خاشاک کے پہلو میں چھپے آن کر آتش
چل بسے دنیا سے بن دیکھے ترا دیدار حیف	وله	لے چلے حسرت بھرا یاں سے دل افگار حیف
جرم پر تیری محبت کے ہمیں کرتے ہیں قتل		حفظ جاں کے واسطے گر کیجئے انکار حیف
مرگ پہلی ہی جب تلک آئے فراق	وله	ورنہ کیا جانوں کہ سر پر کیا بلا لائے فراق
زخم پہلو نے نہ پائی آہ دل ناکام تک	وله	حیف پہنچا ہے نہ اپنا کار شوق انجام تک
صبح کے ہوتے ہی ہو جس کی یہ حالت تباہ		آہ وہ بیچارہ پھر جیوے گا کیونکر شام تک
کر چکا ہے کام اپنا یہاں تو درد انتظار		جب تلک پہنچے ہے قاصد اُس بت خود کام تک
ہم نہ کہتے تھے کہ قدرت مت چمن کی راہ چل		لے گئی آخر ہوائے گل شکنج دام تک

رنگ کچھ اور ہی بدلتا ہے مرا پیتا نب دل
گر سے تھے آکے اس در پہ سمجھ کر اپنا مامن ہم
ہوا یوں پھر گئی اس بزم کی اپنے نصیبوں سے
شب ہجراں کو قدرت اس طرح ہم روز کہتے ہیں
جوں نقشِ قدم ہیں ترے وے خاک نشیں ہم
نسبت ہے ہماری تری جوں سایۂ خورشید
گئے وہ دن کہ پلک مارتے یاں ویرا ہے
تیرے جاں سوختہ خورشید قیامت کے تئیں
بھیج مت مرہم کافور تو قدرت کے حضور
ابرو ترے کہتے ہیں کہ میں تیغ دو سر ہوں
شایستہ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا
دل سے کہا سناں نے کہ سینہ میں یاں رہوں
قدرت بزیر خاک بھی آرام کب ملے
آگ اُس داغ کو لگیو کہ نمک سود نہیں
مرحبا آتش دوری کہ جلایا ایسا
زخم پر زخم لگے تب ہو تسلّی دل کی
شام کو دھوتا ہوں سو خون جگر سے آستیں
تو بھی کم ابر بہاری سے نہیں اے چشم تر
لختِ دل اور اشک ہرگز خاک پر گرنے نہ دے
جنوں تیرے ناخن مگر گھس گئے ہیں
ٹپکنے لگے اشک گلگوں مژہ سے

ولہ — ہے گھڑی آتش کا پرکالہ گھڑی سیماب دل
ولہ — اگر تو سے ہے نہیں راضی تو جاویں آہ کس کن ہم
گنے جاتے ہیں اور سب دوست تیرے ایک دشمن ہم
کبھی سر کو پٹکتے ہیں کبھی کرتے ہیں شیون ہم
ولہ — تا مٹ نہ چلیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم
جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہی نہیں ہم
ولہ — اب بعد خون جگر چشم کو تر کرتے ہیں
ہر سحر پنبۂ ناسور جگر کرتے ہیں
یہ علاج اور ہی زخموں پہ اثر کرتے ہیں
ولہ — عاشق کا یہ دعویٰ ہے کہ میں سینہ سپر ہوں
ای وائے میں قدرت نہ ادھر ہوں نہ اُدھر ہوں
ولہ — ناوک یہ پوچھتی ہے بھلا میں کہاں رہوں
یہ درد و داغ ساتھ ہے میرے جہاں رہوں
ولہ — پھوٹے وہ آنکھ جو لختِ جگر آلود نہیں
جل بجھے سر سے لے پاؤں تلک اور دود نہیں
جو صلے پہ مرے اک زخم کچھ افزود نہیں
ولہ — صبح خون آلودہ ہے پھر چشم تر سے آستیں
کر دے اب رشکِ چمن خون جگر سے آستیں
بھرلے ای قدرت تو اس لعل و گہر سے آستیں
ولہ — کہ عقدہ پڑا ہے بکارِ گریباں
پھر آئی ہے فصل بکارِ گریباں

قافلے کے قافلے اس رہ میں جوں نقشِ قدم	ولہ	ہو گئے پامال تیرے حسرت پابوس میں
بہ نہ کر مرہم سے داغِ سینۂ پر نور کو	ولہ	کوئی بجھاتا ہے ارے ظالم چراغِ نور کو
داغ نے دل کو مرے تنہا نہ چھوڑا ایک دم		زخمِ سینہ سے سدا اُلفت رہی ناسور کو
تب مزا دیوے گا قدرت زخمِ سینہ پر نمک		دے سرِ ناخن سے پہلے آشتی انگور کو
نہ جا اس بزم سے ہرگز جھٹک مت طرفِ داماں کو	ولہ	نہ دے برباد اے ظالم غبارِ خاکساراں کو
ہوا دستِ جنوں سے تار تار از بسکہ پیراہن		گریباں ڈھونڈھے ہے دامن کو اور دامن گریباں کو
تم نے تو منہ چھپایا اُس زلفِ عنبریں میں	ولہ	یہ شامِ غم ہماری اب کس طرح سحر ہو
میں رکھتا ہے ابرو کماں کے نشاں کو	ولہ	ہما چھیڑیو مت مرے استخواں کو
گلوگیر ہے یاں تلک ناتوانی		کہ سینہ سے لب تک نہیں رہ فغاں کو
اُڑائی ز بس خاک ماتم میں دل کے		کیا ہم نے آخر زمیں آسماں کو
نوح کشتی سے خبردار کہ یاں چھاتی تہہ	ولہ	مرہمِ تازہ ناسورِ کہن چھوٹے ہے
کس کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے	ولہ	جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یہاں سے کر گئے		اب دو داغِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	قطعہ	کیا ہی ملکِ روم و کیا ہی سرزمینِ روس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے		چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف		جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے		یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و مکنتِ دنیا سے آج		کچھ بھی ان کے ساتھ جز از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیحِ ریا		آج رہنِ جام نے پھر خرقۂ سالوس ہے
سینہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے	ولہ	تیرِ بیداد جدھر رخ کرے گھر اُس کا ہے
اس گلی سے جو کوئی گذرے سو جی سے گذرے		دیکھ اُس راہ نہ چل راہ گذر اُس کا ہے

تحتِ دل نوکِ مژہ پر نہ سمجھ اے ہمدم
تخمِ غم دل میں جو بویا تھا ثمر اُس کا ہے

نہ تھی تاب نگہ جب لگ گیا وہ دور آنکھوں سے
نہ ہونا چشم کا بہتر تھا ایسی کور آنکھوں سے

جہاں جاوے وہ نورِ دیدہ آنکھوں کے مقابل ہی
جدا ہوتے نہیں جاوے نگہ کو دور آنکھوں سے

زباں قدرت کی ضعفِ ہجر سے از بس ہے لکنت میں
اشارت بات کی کرتا ہے جوں رنجور آنکھوں سے

ولہ

کر اقلیمِ قناعت کا سفر تا تجھ پہ روشن ہو
کہ چشمِ مور سے بھی تنگ تر ملکِ سلیماں ہے

لب قدرت سے جز فریاد کچھ ریزش نہیں کرتا
یہ کچھ شاعر نہیں ہے اپنے دل کا مرثیہ خواں ہے

ولہ

نہ واقف کارواں سے ہوں نہ کچھ آگاہ منزل سے
کیا میں وادیِ اُلفت کو طے اک جنبشِ دل سے

گئے وے دن کہ بہتے تھے پڑے نالے ان آنکھوں سے
سرِ مژگاں تلک اک اشک اب آتا ہے مشکل سے

کرے تو ذبح جب تک اور کو یہ مفت مرتا ہے
نہ ہو غافل ارے صیاد صیدِ نیم بسمل سے

ولہ

غنیمت بوجھ ملنے کو کہ یہ عالم اک افسوں ہے
کدھر فرہاد شیریں ہے کدھر لیلیٰ و مجنوں ہے

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گذری ہے
یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشم پُر خوں ہے

ولہ

آساں نہ کٹے گی یہ جدائی کی جو شب ہے
مشکل ہے قیامت ہے مصیبت ہے غضب ہے

ولہ

دل پُر داغ ہے اور حسرتِ پابوسی ہے
دستِ اُمید ہے اور دامنِ مایوسی ہے

دل گم گشتہ خبردار کہ یاں سینہ میں
تیرِ بیداد سدا اور پئے جاسوسی ہے

دمِ جاں بخش کی اُس کے جو پڑی ہے یہ دھوم
لبِ عیسیٰ نے مگر تیری زباں چوسی ہے

ولہ

جس جگہ جلوہ نرالا یہ مدہوشی ہے
یاد میں اپنے اگر ہے تو فراموشی ہے

آہ یہ کون سی منزل ہے کہ رکھتے ہی قدم
نقشِ پا سے مرے سجدہ کو ہم آغوشی ہے

ولہ

سرگشتہ ترے لئے جہاں ہے
اے خانہ خراب تو کہاں ہے

جو زخم کہ ہو چکے نہ ناسور
وہ زخم نہیں وبالِ جاں ہے

قدرت ٹک کھول چشمِ عبرت
گر فکرِ سراغِ رفتگاں ہے

جو نقشِ قدم ہے اس زمیں پر
آئینۂ حالِ رہرواں ہے

اشک آنے سی کچھ تھم رہے ہے	ولہ	لختِ دل مژگاں پہ شاید جم رہے ہے
ابتو اس منزل سے نہیں اُٹھتے قدم		ہمرہاں آگے چلو تم ہم رہے ہے
ہر آن اک ستم ہے ہر لحظہ اک جفا ہی	ولہ	کوچہ ترا ہے ظالم یا دشتِ کربلا ہے
ملتا نہیں کسی سے اس پر ہی کیا مصیبت		یارب یہ دل ہمارا کس سے جدا ہوا ہے
ہو گرد باد جیدھر ہم کو اُدھر ہے جانا	ولہ	صحرا میں گمرہوں کا یہ خضر رہنما ہے

بابُ الکاف

۱۔ کلیم

کلیم تخلص، شیخ محمد حسین نام۔ شاہ جہان آبادی۔ مشہور سخنور ہے دلّی کا، اور قرابتیوں میں میر تقی میر تخلص کے تھا۔ ایک رسالہ عروض وقافیہ کا اس نے زبان ریختہ میں لکھا ہے، اور خصوص الحکم کا ترجمہ بھی زبان ہندی میں کیا ہے۔ ایک نثر اور بھی رنگین زبان ریختہ میں ریختۂ قلمِ معنی رقم رکھتا ہے۔ لیکن باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور بہت کم رکھتا ہے۔ عہد دولت میں احمد شاہ بن فردوس آرامگاہ کے ایام اس کے شعر و شاعری کا تھا، اور زمزمہ پردازانِ شاہ جہان آباد کے ساتھ ہم صفیر و ہم نوا تھا۔ چنانچہ دلّی ہی میں اس خرابۂ دارِ فانی سے گذرا، اور مقیم بیت المعمور کا شانۂ باقی کا ہوا۔ صاحب دیوان اور شاعر شیریں بیان تھا۔ یہ اُس کلیم طور سخندانی کے کلام سے ہے *

گو روضۂ رضواں کو میں اک آن میں دیکھا	ولہ	جب گل کی طرح جھانک گریباں میں دیکھا
لگتی ہی اب تو قلقلِ مینا سی دل کو ٹھیس	ولہ	وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
قبر میں بھی سے لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم	ولہ	آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا
رکھتا ہے زلف یار کا کوچہ ہزار پیچ	ولہ	اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ ما پیچ
ہو چکا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق	ولہ	رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز

پوچھ مت غم کی داستاں اے دل	ولہ	گر پڑا ٹوٹ آسماں اے دل
پیری کی بھی سیر کر گئے ہم	ولہ	اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم
واں غصہ ہوئے رقیب پر تم		یاں مارے ادب کے مر گئے ہم
بات اُس کی زبان پر آئی	ولہ	پھر خرابی جہان پر آئی
غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے	ولہ	غرض ہم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے
اُس کے ابرو کی اگر تصویر کھینچا چاہیئے	ولہ	اوّل اپنے قتل پر شمشیر کھینچا چاہیئے
عرق ہی منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہی	ولہ	عجب ہے مجھ کو کہ شعلہ سے آب ٹپکے ہی
تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہی برسات		پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے
گلرو تو چمن میں اچپلی سے نہ گیا	رباعی	یہ دل بھی کلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں		دل سے تو کوئی تیری گلی سے نہ گیا
دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم	رباعی	اس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری محنت و کسب		جب کچھ نہ بنا کہا کہ درویش ہیں ہم

بابُ اللّام

۱۔ لُطف

لطف تخلص، مرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشان کا، کہ مانند نامۂ اعمال اپنے کے سیاہ کئے۔ اور اسمِ گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے متوطن استرآباد شجاعت بنیاد کے ہیں۔ سنہ ۱۱۵۴ گیارہ سو چون ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد میں تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی، مصدر عنایات بادشاہی ہوئے۔ آگے بیان امورات دنیوی باعث ہے طول کلام کا، اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص

وعام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو یدطولیٰ تھا، اور ہجری تخلص آپ کا تھا۔ اس تذکرہ میں اشعار ہندی کا التزام ہے، اس سبب سے یہاں لکھا نہیں گیا آپ کا کلام ہے۔ اصلاح خدمت کی اس ہیچمدان کو آپ ہی کی جناب سے ہے، اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے۔ یہ خذف ریزے کتنی ایک کہ سرابِ گاہ طبع ناقص سے فراہم ہوئے تھے، عرضِ خدمت اربابِ معنی کے کئے جاتے ہیں۔

پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا

بلبل و گل ہیں وہ جوشش سرو قمری میں یہ ربط
گلستانِ دہر میں پھر دل کی تپتیں اُٹھائیں کیا

غیر لبریز شکایت ہے مری جانب سے آج
سُن کے میرے قدرداں اب دیکھئے فرمائیں کیا

چمن کو گل جو تری مے کشی کا دھیان آیا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا

رہا جو زندہ شبِ تیرۂ فراق میں قیس
سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اُس کو دھیان رہا

جو عمرِ خضر ہو شاید تو وصل ہووے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

نہ آنکھ بھر کے کبھو ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

نہ کر اے بلبلِ دل سوختہ صیاد کا شکوا
کہ جاں بازوں کے دیں میں کفر ہے جلاد کا شکوا

نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سُنے فرہاد کا شکوا

میں اپنے سرو قامت سے ہی کیا شاکی تھا گلشن میں
تسلی ہو گئی قمری سے سُن شمشاد کا شکوا

نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہے اک جہاں اس خانماں آباد کا شکوا

ترے کانوں تلک بھی لطف [illegible] تا ہے
ہے اک عالم کو تیرے [illegible] فریاد کا شکوا

وله

ایک دن حالِ دلِ زار نہ دیکھا نہ سُنا
سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سُنا

دیکھ کل نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب
کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا

وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سُنا

لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفِ مژگاں پہ نمود
اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سُنا

چشم اور گوش زمانہ ہیں مقر اس کی لطف — ثانیِ حیدرِ کرار نہ دیکھا نہ سنا

وله

ہے اس شدت سی رنگینیٔ کوئے یار کا چرچا — کہ بھولا عندلیبوں کو گل گلزار کا چرچا
ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبت تو غنیمت ہی — ہوا ہے اب حکیموں میں مری آزار کا چرچا
برنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا ساکت — ہی اس پر اس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا
ہمیں ہی یار کی چرچے سے یہ فرصت کہاں ہم — کہ اب دن رات بیٹھے کیجئے اغیار کا چرچا
بیانِ دردِ دل کس لطف سے کرتے ہزار افسوس — جو ہوتا بزم میں اس کی کبھی اشعار کا چرچا
زہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھے تھے — کھلی چشمِ حقیقت میں تو کامِ اژدہا نکلا
نہ کر اے لطف ناحق رہروانِ دہر سی حجت — یہی رستہ تو ٹھا کر بھی سے کعبہ کو جا نکلا

وله

ازبس نہ ہوا ہم سے سرانجامِ محبت — شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نامِ محبت
فرہاد سا نہ رنگ نہ مجنوں سا کیا حال — کس منہ سے اسے بھیجئے پیغامِ محبت

وله

کیونکر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل — ہیں دل میں تو سو باتیں اور جنبشِ لب مشکل
اک آہ کے کرنے کو سوچا ہئیں تمہیدیں — کس سی کہیں حالِ دل ہی آہ عجب مشکل
دو لاکھ بہانے ہوں نت روئے دو آنسو — دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل

وله

یاروں نے یہ تو کہئی کیا کیا سجھائیاں ہیں — بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں
میں کیا ہوں باختہ رنگ اس شعلہ رنگی آگی — ہتا ہے کبھی منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں
اک جوئے شیر بہلے اے آفریں ہی فرہاد — کیا بے ستوں میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں
کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے — گو سیکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں
طاقت حباب سا اک نظارہ کی ملی ہے — ان فرصتوں پہ ظالم یہ خودنمائیاں ہیں
کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بتکدہ سی آگاہ — یہاں آستانِ دل ہی اور جبہ سائیاں ہیں
اُس قد کا سرو سی ذکر چھوٹا منہ اور بڑی بات — غنچہ کی دل میں کیسے ڈھب باتیں سمائیاں ہیں
ای لطف اس غزل پہ کہنا بقول سودا — یہ عاشقی نہیں ہی زور آزمائیاں ہیں

او میاں تیغ والے اور اک زخم
کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں
برگِ گل جیسے بنمط خزاں میں جھڑتے ہیں
لختِ دل یوں مژہ سے جھڑتے ہیں
بس غمِ یار اب نہ سہ جلدی
ورنہ اب یار ہی نبڑتی ہیں

ولہ

تم ہو بزمِ عیش سے وہاں اور صحبت داریاں
ہم ہیں کنجِ غم میں یہاں اور جان سے بیزاریاں
تم کو سیرِ باغ و گلگشتِ چمن کا وہاں ہے شوق
یاں بدن پر ہے ہجومِ داغ سے گلکاریاں
دھیان ہے آرایشِ زلفِ پریشاں کا تمہیں
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خوابیاں
تم صفاء ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یہاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر زاریاں
تم نے دکھلائی وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھبن
یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے سے لہریاں
نیک و بد دونوں سے یہاں ہم نے تو آنکھیں موند لیں
تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادوگاریاں
یہاں برنگِ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں
قہقہے تم مارتے ہو وہاں بآوازِ بلند
دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں
ہر مریضِ غم کی جان بخشی کا ہے تم کو دھیان
کھنچ گئیں یاں طولِ شدت سے مری بیماریاں
اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یہاں رازِ عشق
سوجھتی ہیں وہاں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں
کیا کسی سے بات کیجے بھولتے اک دم نہیں
اُن بھلاؤں سے وہ باتوں میں تری عیاریاں

نہیں یہ شیشہ مست ای محتسب مجھ دم میں
دھرا ہے آبلۂ دل ہمارے پہلو میں
کب اپنی چشم میں طوفانِ نوح کو ہو قدر
نہاں ہے یہاں وہی عالم ہر ایک آنسو میں
اگرچہ فرق زمیں آسماں کا ہے تاہم
ملے ہے وضعِ فلک کی بہت تری خو میں

ولہ

غبارِ بیکسی سے کیا ضرر پاکیزہ جوہر کو
کہے تخشے ہے جلا گرد یتیمی آبِ گوہر کو
گذر جا سر سے مانندِ قلم گر ہے سرِ شاہی
نہ آساں سمجھیو پانا سنیۂ تختیِ افسر کو
کبھی تو خاکساروں کا بھی غم خانہ کرو روشن
نہیں گو کچھ بھی نقشِ بوریا تو ہو گا بستر کو
چھلکتا عمر کا اک دم میں پیمانہ ہے ای ساقی
وفا دشمن شتابی کر ذرا لبریز ساغر کو

پھرا مجنوں کا دل سنگِ ملامت سی نہ مرنے تک
بُرا ہی چاہئے بحرِ جنوں میں بار لنگر کو

کیا ہم نے تو ترک مدعا کو مدعا اپنا
خدا توفیق بخشے نیک چرخ سفلہ پرور کو

وله
نہیں معلوم کیا اس سینۂ سوزاں میں پنہاں ہے
کہ ہر تارِ نفس جوں رشتۂ شمع آج سوزاں ہے

نہ میں فرہاد ہوں ای عشق نہ مجنونِ دل خستہ
مرا پھر منتظر بتلا تو کیوں کوہ و بیاباں ہے

تری طرزِ سخن پہنچی کہیں اے لطف گلشن میں
نئے انداز سے بلبل چمن میں اب غزل خواں ہے

وله
جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں لگے ہوئے
دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگے ہوئے

اللہ رے قید خانۂ ہستی کہ دم کے ساتھ
ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے

رویا میں دیکھ مرقد مجنوں کو دھاڑ مار
تھے جائے گل درختِ مغیلاں لگے ہوئے

بارے چھٹا اسیرِ بلا اس گلی میں آج
ہیں تو وہ ہائے گنجِ شہیداں سے لگے ہوئے

بیمار کا ترے تو کھلا حال بعد مرگ
سینہ میں زخم تھے کئی پنہاں لگے ہوئے

یارانِ پیش رو ذرا ٹھیرو کہ جوں جرس
ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگے ہوئے

رکھ سوچ کر قدم مرے وادی میں گردباد
پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگے ہوئے

کوئی تو میرے ناصحِ دانا سے یہ کہو
دل چھوٹتے ہیں باتوں میں ناداں لگے ہوئے

کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتے تھے مثلِ زلف
کانوں سے اس کے ہم سی پریشاں لگے ہوئے

وله
خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی
ٹک جو گرہ نقاب کی اس کے سرک گئی

وله
سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے
اب کی فصلِ گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے

شہر میں پایا نہ تیرے جور نے شہرا کہ اب
گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے

بزم میں آیا جو شب وہ گل رخ خوں شمع سے
بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے

سنتے ہیں کی محتسب نے بیعتِ دستِ سبو
مژدہ مے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے

تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم
آشنا ہو تجھ سے اک عالم سی بیگانے ہوئے

وله
روشن ضمیر کیونکہ نہ ہوں دل کے داغ سے
خورشید کو ہے کسبِ ضیا اس چراغ سے

وہ خود فروش آگیا بارے چمن میں گل
بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے

ہو وے فضائے ہستی موہوم کا برا
کنج عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے

اُس گلبدن بغیر ہمیں سیر باغ میں
صوت ہزار کم نہیں فریاد زاغ سے

جس دل زدے کو نغمۂ بلبل ہو بانگ زاغ
کیا خاک وہ شگفتہ ہو گلگشت باغ سے

ولہ

دیکھا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی
اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی

رخصت ای اہل وطن اب ہم ہیں اور آوارگی
حق رکھے بنیاد قایم گردش ایام کی

پاؤں نے اُن تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ
ہر قدم پہ جان ماری ہے دل ناکام کی

گردش چشم بتاں کے بسکہ ساغر نوش تھے
گردش گردوں کو ہم کہتے تھے گردش جام کی

جب سے کھینچا لطف رنج فرقت یار و دیار
اب ہوئی معلوم محنت گردش ایام کی

کیوں دل پہ مرے جادو اُن آنکھوں کا نہ ٹھن جائے
جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے

پلکیں وہ نکیلیں کہ نظر جب پڑے اُن پر
سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے

بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

ولہ

کیا سبب بتلائیں ہنستے ہنستے باہم رک گئے
خود بخود کچھ وہ کھنچے ادھر ادھر ہم رک گئے

دیر تک ضبط سخن کل اُس میں اور ہم میں رہا
بول اُٹھے گھبرا کے جب آخر کے تیئں ہم رک گئے

ولہ

ادھر سے جتنی یگانگت کی اُدھر سے اُتنی ہوئی جدائی
بڑھائی تھوڑی سی جب اُدھر سے بہت سی تم نے ادھر گھٹائی

نہ ہم سے بگڑو نباہ دو جی نہیں ہے کچھ تم کو دھیان اس کا
کہے گی خلقت کہ ہو چکی بس وہ دیکھو دونوں کی آشنائی

رباعی

جنت سے کہے بزم مری تو دیکھو
یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ آئینہ محل کا تیرے
کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

رباعی

منہ رکھتی ہیں کیا صاحب تاج و دیہیم
جو خاک نشینوں کے تئیں جانے سقیم
ہم آنکھ اُٹھا دیکھیں نہ گردوں کی طرف
گر خم نہ ہو ماہ نو برائے تعظیم

باب المیم

میر

میر تخلص، نام نامی اس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے یہ متوطن اکبر آباد کے سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتدائے سن شعور سے پرورش انہوں نے دار الخلافہ شاہ جہان آباد میں پائی ہے، اور خان مذکور کے فیض صحبت سے تنظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے، فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے، اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے۔ تو وہ اس بات کو جانتا ہے، اور اس رمز کو پہچانتا ہے، کہ میر شیریں مقال ہیں، اور ریختہ گویان سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے، اور فرق سفید و سیاہ ہے، بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی، اور اس خراش سے عارض رقم کی، مراد یہ ہے کہ ناقدر دانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوا شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ کو گئی، تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجبول کے محمول ہوئے، اور جوانان نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔

زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست حمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں، کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے

نوجوان غور کیے میں ہویدا ہیں۔ اب بھی جو بوجہ تمکنتِ معنی کا جرِ ثقیل طبع سے ترازو کر کے وہ دکھلاتا ہے جوان اگر کوہ بوقبیس ہے تو تحمل سے اُس کے کمر جُراتا ہے۔ بہر تقدیر غرض جب میرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے عالم باقی کو سدھارے، تو میر مذکور شاہ جہان آباد میں تھے سنہ ۱۱۹۷ گیارہ سو ستانوے ہجری میں رایات عزم اس صاحب لشکرِ مضامینِ تازہ کے حرکت میں آئے، اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا، اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نوابِ مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد وزارت میں آج کے دن تک، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، وہی حال ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسامِ نظم میں یہ صدر نشین بارگاہِ سخندانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں یدِ بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم میرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرزِ مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے، خصوصًا دریائے عشق، جوان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قومِ سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحبِ چار دیوان، خوش بندش خوش بیان ہے مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب افکار ہیں +

اس دور میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروّت کو کیا ہوا

اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مرچلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

ولہ

چمن میں گل نے جو کل دعوے جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

ولہ

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا حالت جگر کی گم ہے
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

وله

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے بُت خانے نگاہِ مست نے ساقی کے انتقام لیا
وہ کج روش نہ ملا راستے میں ہم سے کبھو نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا
پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
اُس آئینہ کے مانند زنگار جس کو کھا جائے کام اپنا اُس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا
لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور اُس کے کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا
مستوری خوبروئی دونوں نہ جمع ہوویں خوبی کا کام کس کے اظہار تک نہ پہنچا
یوسف سے لے کے تا گل اور گل سے لے کے تا شمع یہ حُسن کس کہ لے کے بازار تک نہ پہنچا

وله

گُل کو محبُوب میں قیاس کیا فرق نکلا بہت جو باس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی کیا پتنگے نے التماس کیا

وله

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر پڑا جو میر یک سر وہ اُستخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سرِ پر غرور تھا

وله

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

وله

گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر دیکھتا نہیں مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
یک قطرہ خوں ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

وله

سر سے باندھا ہی کفن عشق میں تیرے یعنی جمع ہم نے بھی کیا ہی سر و ساماں یکجا

وله

دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
گندی ہی لہو وہاں سرِ ہر خار سے اب تک جس دشت میں پھوٹا ہی مرے پاؤں کا چھالا

دل کے جانے کا نہایت غم رہا
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

تجھ کو میرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کای سرکشاں جہان میں کھینچا تھا ہم نے میر
پایانِ کار مور کا خاک قدم ہوا

دل و داغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کچھ کہ یہاں ہے سو افسوس ہی جوانی کا

ولہ
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

ولہ
جو یہ دل ہے تو کیا سر انجام ہوگا
تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا

ولہ
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

ولہ
دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے وہ آگے درد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

ولہ
خوبی کو اُس کے چہرے کی کب پہنچے آفتاب
ہے اس میں اس میں فرق زمین آسمان کا

کام دل میں مرا تمام کیا
غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے
یہیں سے کعبہ کو سلام کیا

ولہ
وصفِ خط و خال میں خوباں کی میر
نامہ اعمال سیہ کر گیا

ولہ
جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

تو اب گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

مجھے کام ہر دم ہے رونے سے ناصح
مرے مُنہ کو کب تک تو دھوتا رہے گا

مرا خوں تجھ پہ خوں ثابت کرے گا
ولہ
کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا

وصیت میر نے مجھ کو بھی کی تھی
کہ سب کچھ ہونا اک عاشق نہ ہونا

ولہ
کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے
سہتا رہا جفا ہی میں جب تک جیا کیا

مغاں مجھ مست بن پھر قلقل مینا نہ ہووے گا
مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لیلے کے رو دیگا

ولہ
آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین
معلوم نہیں میرا ارادہ ہے کہاں کا

ولہ
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

کس کا کعبہ کس کا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے تیرے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں بیٹھا رات کو تھا میخانے میں
جُبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

کاش اب برقع منہ سے اٹھاوے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ موندے پر اپنی اُن نے گو دیدار کو عام کیا

یہاں کے سفید و سیہ میں دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

زندگانی بھی ایک وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ضعف یہاں تک کھنچا کہ صورت گر
رہ گیا ہاتھ میں قلم لے کر

ولہ
کام آنے کا نہیں ایک بھی یار آخر کار
ہاتھ سے جائے گا سررشتۂ کار آخر کار

مشت خاک اپنی جو پامال ہی یہاں اس پہ نہ جاؤ
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار

ولہ
میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
جس کی لے دام سے تا گوش گل آواز ہے ایک

ناتوانی سے نہیں نالہ فشانی کا دماغ
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک

گوش کو ہوش سے ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

ولہ
گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل
اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

ولہ
سیر کر عندلیب کا احوال
ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

ولہ

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں / وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہی کہتا ہے یہی / کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
چلا نہ اٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر / ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

ولہ

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہو کیا نہیں / تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میر ترک کر / کعبہ میں جا کے بیٹھ میاں تیرا گر خدا نہیں
گردش فلک کی کیا ہی جو دورِ قدح میں ہوں / دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں
عاشق ہی یا مریض ہے پوچھو تو میر سے / پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

ولہ

صد تمنا سے یار رکھتے ہیں / تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
پھیر کرتے ہیں میر صاحب عشق / ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

ولہ

دن گذرتا ہی مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو / رات جاتی ہی اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میر / یار مستغنی ہے اُس کو مری پروا کیا ہو

ولہ

عشق کو نفع نہ بیتابی کری ہے نہ شکیب / کرے تدبیر جو یہ درد وہ دوا رکھتا ہو
ہائے اے زخمیِ شمشیرِ محبت کا جگر / درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

ولہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے / میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ولہ

یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے / مرجائے ولے اُس کو یہ آزار نہ ہووے
زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مر جائے / پر دامِ محبت میں گرفتار نہ ہووے
اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد / یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے
مانگے ہے دعا دیکھ مجھے خلق یہ ظالم / یارب کسی کو اس سے سروکار نہ ہووے
صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر / یہ سیر سرِ کوچہ و بازار نہ ہووے

جو دے آرام ٹک آوارگی میر / تو شامِ غربت اک صبحِ وطن ہے

ولہ

عشق میں بے خوف و خطر چاہیے / جان کے دینے کو جگر چاہیے

باقلِ آغوشِ ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
شرطِ سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

وله
نہیں وسواس جی گنوانے کا — ہائے رے ذوق دل لگانے کا
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھا بہانے کا

وله
اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
اُس کی شمشیر تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے
یاں ہوئے میر ہم برابر خاک — وہاں وہی ناز و سرگرانی ہے

وله
اوا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی — وے تصویر کھینچے گا یہ ہم نے مانی

وله
گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

وله
کیا حال بیاں کریئے عجب طرح پڑی ہے — وہ طرح تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں — یہ گاڑی مری راہ میں بے طرح اڑی ہے
ہے چشمکِ انجم طرف اُس مہ کے اشارے — دیکھو تو مری آنکھ کہاں جا کے لڑی ہے
وہ دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں — اب یہاں ہیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے
ایسا نہ ہوا ہو گا کوئی واقعہ آگے — اک خواہشِ دل ساتھ مرے جی کے کھڑی ہے
جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

رباعی
اب عشق میں میر پاؤں دھرتا ہے گا — سب زیست منغص اپنی کرتا ہے گا
یارو چلو سب چل کے اُسے سمجھاویں — افسوس کہ نوجوان مرتا ہے گا

دیگر
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے — ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

دیگر
اب وقتِ عزیز کو جو یوں کھوؤ گے — پھر سوچ کے غفلت کے تئیں رو گے
کیا خوابِ گراں پہ روز و شب مائل ہو — جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

دل غم سے ہوا گداز سارا اللہ
غیرت نے ہمیں عشق کی مارا اللہ
ہی نسبتِ خاص تجھ سی ہر ایک تئیں
کہتے ہیں چنانچہ سب ہمارا اللہ

دیگر

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے
خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخرِ عمر میر جی کی خاطر
سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

۲ مظہر

مظہر تخلص، میرزا مظہر جان جاناں کر کے مشہور تھے۔ مشہور سخنوروں میں دلی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان، اور اندازِ گفتگو میں نادر زبان تھے۔ اصل وطن ان کا اکبرآباد ہے، اور دلی ان کے نشو و نما کی بنیاد ہے۔ قناعت اور استغنائے طبیعت کے ساتھ مشہور، اور علم و عمل سے فقہ کے معمور تھے۔ حسن پرستی و دل بستگی سے رغبت تمام رکھتے تھے، اور عشق حقیقی و مجازی سے کام۔ انعام اللہ خاں یقین اور فقیہ صاحب دردمند اُن کے شاگردانِ رشید سے کہاتے ہیں، اور میر عبدالحی تاباں تخلص بھی علیٰ ہذا القیاس اسی طرح سے گنے جاتے ہیں +

کہتے ہیں کہ ہفتم روز عاشورہ کو لبِ بام یہ اپنے گھر میں سرِ راہ بیٹھے تھے، اور کوئی سردار روہیلہ کا بھی آیا ہوا تھا واسطے ان کی ملاقات کے، کہ ناگاہ گذر شدوں کا ان کے زیرِ بام سے ہوا، اُس روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی، اور مواتف سلام سے ہوا، اور میرزائے مذکور جس طرح بیٹھے تھے اُسی طرح بیٹھے رہے، بلکہ متبسم ہو کے فرمانے لگے کہ "بارہ سو برس جس مقدمے کو ہو چکے ہوں ہر سال اُسے زیادہ کرنا کیا بدعت ہے، اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفت ہے"۔ یہ گفتگو بجنسہ وہ لوگ جو کہ علم اور شدوں کے ساتھ تھے اُنھوں نے سنی، اور تعصب کی مرزائے مذکور کے امام باڑوں میں اور محفلوں میں دو تین شب گفتگو رہی۔ آخر شب شہادت کو، کہ عبادت شب دہم عاشورہ سی ہے، کوئی شخص ان کے دروازے پر آیا، اور ان کو باہر بلوایا جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ طپنچے کی نذر کی، اور کام ان کا پورا کر کے نلوہ راہ اپنے گھر کی لی۔ سن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا، اور

ایسا زخم کاری کھایا، لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا۔ سنہ ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری تھے کہ اُس روشن ساز مسائل صدیقی نے، اور اُس معقلہ پرواز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریقت پر کیا۔ یہ اشعار اُن کے نتائج افکار سے ہیں ؛

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا ؎
اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

وله
نہیں کچھ غم کہ یوں ملتا نہیں بیاں گسل میرا
کہیں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا

وله
ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو کیا ہے کام گلشن سے ولیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں کہ آتی ہے بہار

وله
مرتا ہوں میرزا سے گل ہر سحر
سورج کے ہاتھ جو مری وہ ملتا صبا کے ہاتھ

مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کے تئیں مرے
یہ شیشہ بیچتا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

وله
خدا کے واسطے اُن کو نہ ٹوکو ؎
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

۳ مضموں

مضمون تخلص، شیخ شرف الدین نام، متوطن باج موہ کے تھے۔ باج مؤ ایک قصبہ ہے قصبوں میں سے اکبر آباد کے۔ جس ایام میں کہ وطن سے اپنے یہ وارد شاہ جہان آباد میں ہوئے تھے، تو زینت المساجد میں آن کر اُترے تھے۔ طور ان کی بود و باش کا پھر وہیں رہا ہے۔ اور اتفاق اصلاح کا سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوا ہے۔ ازبسکہ شیخ مذکور علت سے نزلہ کے منہ میں ایک دانت

ٰ۱ کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے۔ عاش حمیدا مات شہیدا
لطف یہ ہے کہ یہ الفاظ حدیث نبوی کے ہیں ۱۲

نہیں دھرتے تھے، تو خان آرزو انہیں شاعر بیدانہ کہا کرتے تھے۔ دلی میں نظمِ وجود کو انہوں نے ناموزون بوجھا ہے، اور مضمونِ عالی انہیں سیرِ وجود کا وہیں سوجھا ہے۔ بیشتر حسن ان کے کلام میں ایہام کا ہے۔ یہ منتخب ان کے کلام کا ہے ؎

افسوس مار جھٹ پٹ دل کو رکھے ہیں اٹکا		کس ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا
خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سے	وله	دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا
نہیں ہے زاہدوں کو مے ستی کام	وله	لکھا ہے اُن کی پیشانی میں سرکا
ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا	وله	صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا
کوچے میں بیوفا کے مارے گئے ہیں عاشق	وله	نکلا ہے ایک مضموں بھاگوں سے اپنے جینا
ترا مکھ ہے سر چشمۂ آفتاب	وله	نہ لاوے تری حسن کی ماہتاب
جس طرح سے رہے ہے مال کی اوپر کالا	وله	یوں رہی زلف تری منہ کے اوپر مار کے پیچ
گر ہی دار ہے کامل کو سر تاج	وله	ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج
ایک تو تھا ہی وہ مہ رو خود پسند	وله	ہو گیا آرسی کے تئیں دیکھ دو چند
تجھ بن زبس کہ پانی جاری کئے ہیں رو کر	وله	چشموں سے میں اب اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر
تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر	وله	آب پیکاں کا اس طرف سے ڈھال
کیفی ہو کر جو مجھ سے رہا ہے وہ شوخ	وله	جو پوچھتا ہوں بات تو کہتا ہی چل بچل
احوال پیش دلبر کچھ مت کہو ہمارا	وله	آتا ہے نام میرا سُن کر اُسے پسینا
شرم سے پانی ہو جاویں رقیب	وله	جو مرا یوسف ملے آ چاہ سے
وہی دلدار خوش آتا ہے جو ہووے بانکا	وله	خوب لگتی نہیں وہ تیغ جو خمدار نہیں
کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں	وله	جانتا ہے خوب وہ مضمون کو
اُس دہاں بیچ سخن رکھتا ہوں	وله	مجھ پہ اس بات کو اثبات کرو
جب سے چاہا ہے ترا چاہِ ذقن	وله	آب چشموں سے مرے جاری ہے

نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں
وله گذرتا ہے مجھے یہ چاند خالی

چلا کشتی میں جب آگے سی وہ محبوب جاتا ہی
کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

یہ اشک آنکھوں میں قاصد کس طرح یک دم نہیں تھمتا
وله دل بیتاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے

مرے آئینۂ دل سے ترا نقش
وله جو دیکھا تو کسی صورت نہ جاوے

مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سُن رقیب
وله غصے سے بت سا ہو گیا لیکن جلا تو ہے

۲ مخلص

مخلص تخلص، مخلص علی خاں نام، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے ساکن مرشد آباد، میر باقر کر کے مشہور تھے۔ جوان خندہ رو اور کشادہ پیشانی، ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگالے میں بہت کیفیت کے ساتھ انہوں نے گذر کی ہے، اوقات بیشتر عیش و کامرانی میں بسر کی ہے، شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا، اور رات دن وقف احباب گردنِ صراحی اور لبِ جام تھا۔ زبان ریختہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ چنانچہ دیوان بطور اساتذہ ترتیب بھی دیا ہے لیکن کثرتِ عیش سے ازبسکہ دھیان رہا کہیں کا کہیں ہے، کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے۔ شاید ۱۲۰۷ھ بارہ سو سات ہجری میں بلدۂ مذکور کے اندر دام ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی ہے، اور سیر چمنستانِ عدم کی عینِ تعیش میں فرمائی ہے۔ یہ اشعار اس ستودہ کردار کے ہیں۔

مد بسم اللہ ابرو سے ہے رخ عنوان کا
حُسنِ معنی کیوں نہ مفتوں ہو مرے دیوان کا

اب ٹک تو اس کو آ کے جفا کار دیکھنا
وله مرتا ہے کوئی دم میں گرفتار دیکھنا

ہمارے قتل کرنے سے تجھے آرام کیا ہو گا
وله میاں اس ظلم کا تو ہی سمجھ انجام کیا ہو گا

بدی میں یاں تلک مشہور دنیا ہے مرا مخلص
پھر اس بدنام سے آگے کوئی بدنام کیا ہو گا

ہاتھ ملتا ہے کہ میرے دل کے ہوتے حیف ہے
وله کیوں کف پا ہیں ترے رنگ حنا سے آشنا

یہ پوچھو خضر اسمٰعیل سے گر تم نہیں واقف	ولہ	حیاتِ جاوداں بہتر ہے یا سر کو فدا کرنا
ترکِ اُلفت یہ بتوں کی مجھے مقدور نہ تھا	ولہ	ورنہ کعبہ مرے بت خانہ سے کچھ دور نہ تھا
مخلص کیا دریافت یہ میں سنگ محک سے	ولہ	جو عیب کسی کا کہے منہ اُس کا ہو کالا
آخر یہ دل ہمارا کچھ داد کو نہ پہنچا	ولہ	جز نالہ کوئی اُس کی فریاد کو نہ پہنچا
ہو گئے داغ نمکداں مرے ای کان نمک	ولہ	جب ستی لب کا ترے شور پڑا کان میں آ
اگر یاد کرو ہووے لب کو ترے	ولہ	نہ ہو مست کو یہ خمارِ شراب
زخم دل سینے کو کہتا ہے مرے کام آتا	ولہ	باقی رہتا جو کوئی تار گریبان کے بیچ
گئے یہ بال و پر برباد صیاد	ولہ	قفس سے اب نہ کر آزاد صیاد
دیکھیو نرگس نہیں پھولی یہ باغ و دشت میں	ولہ	دور سے آنکھیں خزاں کی تئیں دکھاتی ہے بہار
دل خستہ و سودا زدہ تدبیر ہے نازک	ولہ	دیوانہ زبردست او زنجیر ہے نازک
محبت میں تری جا کر پھنسا دل	ولہ	دریغا ہائے دل وا حسرتا دل
تھی یہ خوشی کہ ہوگا مرے دل کا غم تمام	ولہ	وہ تو ہوا نہ کم پہ ہوئے ہائے ہم تمام
کیوں عبث میں علاج داغ کروں	ولہ	خانۂ دل کو بے چراغ کروں
کیوں نہ ہر دم مری آنکھوں سے چوے ہائے لہو	ولہ	داغ ایسا نہیں کوئی دل میں کہ ناسور نہیں
منظور بندگی مری ہو تجھ کو گو نہیں	ولہ	میں دست کش ہوں تجھ سے یہ ہوتا ہی سو نہیں
ملی جب خواب سے اُٹھ آنکھ تو نے صحنِ گلشن میں	ولہ	شگفتہ ہو گئیں گلزار میں نرگس کی سب کلیاں
کیوں کیا جھاڑ کے نو بیت غبار دامن	ولہ	کچھ نہ اتنا تھا میاں وہ ترا بار دامن
نہ لی آخر خبر اس نیم بسمل کی کبھو تو نے	ولہ	تجھے صد آفریں صیادیوں ہی صید کرتے ہیں
جن کو دولت ہے شہادت کی تمنا مخلص	ولہ	تیغ بیداد کو وہ بال ہما کہتے ہیں
گرم جوشی سیتی مخلص سے ملے ہے جب یار	ولہ	رشک سے اُس کے رقیبوں کے جگر جلتے ہیں
ستم سے ترے آشنا کم رہے ہیں	ولہ	ہمیں ہیں کہ اب تک کہ یہاں تم رہے ہیں

کہتے تو ہو ملنے کی آتی ہیں ہمیں گھاتیں	وله	جھوٹے ہو میاں تم تو کہنے کی ہیں یہ باتیں
روتے روتے جو کبھی ہوش میں آجاتا ہوں	وله	شرم سے اپنے میں جیسے کہ مُوا جاتا ہوں
اُس کے یہ ظلم وستم کچھ نہ کہے جاتے ہیں	وله	نہ ہمیں چھوڑے بنے ہے نہ سہی جاتی ہیں
کہتا ہے تو جو ہر دم شمشیر سے ہے اور میں ہوں	وله	یہ طشت ہے اور سر ہے تو قصیدہ اور میں ہوں
مخلص ترے کے یار بہت ہیں گے مشتری	وله	تم بھی اگر ہو اُس کے خریدار کچھ کہو
آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے	وله	دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے
عاشق سوائے رونے کے اور کام کیا کرے	وله	جس کا جلا ہو دل سو وہ آرام کیا کرے
قاصد کو دیکھ دور سے دیتا ہے گالیاں	وله	ایسی پری کو پھر کوئی پیغام کیا کرے
مرے دل میں آشنا بسا آکے تو ہے	وله	کہ مجھ کو پڑی اپنی اب جستجو ہے
ڈرتا ہوں محبت مری اظہار نہ ہووے	وله	مجھ سے کہیں آزردہ وہ دلدار نہ ہووے
دل کو مرے ہرگز کبھی آرام نہ ہووے		آغوش میں میرے جو دل آرام نہ ہووے
یہ دشت خاک اُڑجاتی ہو جب ملنے کو مجنوں سے	وله	بگولے آگے آتے ہیں اُسے لینے کو ہاموں سے
کیوں کہ ہووے گی زندگی اب آہ	وله	دل کی نوبت تو جان پر آئی
نہیں یک دل سلامت اس میں پایا	وله	شکن اُس زلف کی کیا دل شکن ہے
چمن میں قد نے ترے طرح جلوہ جب ڈالی	وله	نہال وگل نے کہا مد ظلّہ العالی
ڈرتے ہو دامن آہ کے شعلہ سے جل نہ جائے	وله	عاشق کی خاک پر نہیں آتے میاں کبھی
کوئی اپنے اسیروں سے تغافل یوں بھی کرتا ہے	وله	قفس میں مر گئے ہم یہ خبر صیاد کو پہنچے
سحر روتے لہو اور کرتے شام آہ رسا گذری	وله	کبھی تو نے نہ پوچھا آہ مخلص پہ کیا گذری
مخلص سا وفادار کوئی ہم نے نہ دیکھا	وله	اس طور کا بندہ نہیں ہوتا ہے خدا دے
رہتا ہے غضب مجھ پہ تو ہر شام و پگاہ	رباعی	کرتا ہے تو ثابت مری گردن پہ گناہ
تمہیں نہیں اتنی بھی ظالم درکار		مطلوب اگر سر ہے مرا بسم اللہ

ناصح میں عجب دیکھی مروت تیری	رباعی	عاشق کے ستانے میں ہے رغبت تیری	
دل غم سے نہیں بھرا ہے اتنا میرا		جو اس میں سماوے یہ نصیحت تیری	

۵-مجذوب

مجذوب تخلص، میر غلام حیدر نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا سرتاج شعراے بلند مقام میرزا رفیع سودا شاعر شیریں کلام کا ہے۔ آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف، درد دل اور گداز طبیعت میں مشہور و معروف۔ نظم ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، اور حسن ترکیب میں ناظم رنگیں بیان۔ تلاش سے معنی تازہ کے حتی الامکان نہیں گذرتے ہیں، اور باندھنے سے مضامین مشہور کے حتی المقدور کنارہ کرتے ہیں دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انہوں نے کیے، اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں رہے غرض بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ساتھ عسرت معاش کے لکھنو میں جیتے ہیں مصرع لخت دل کھاتے ہیں اور خون جگر پیتے ہیں + یہ منتخب افکار اس ستودہ اطوار کا ہے +

خوباں سے جو دل ملا کرے گا		دھڑکا ہے یہی کہ کیا کرے گا	
عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں	وله	بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں	
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی		تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں	
آوے ہے مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو	وله	بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو	
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے	وله	یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے	
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر		صیاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے	

۶-مصحفی

مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، ساکن امروہے کا۔ اپنی قوم کا اشراف ہے، سچ تو یہ ہے کہ گفتگو اس کی بہت صاف صاف ہے، بندش نظم میں اس کے ایک صفائی اور شیرینی ہے، اور معنی

بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی۔ ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں مقیم شاہ جہان آباد کا رہا ہے۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے ضیقِ معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیبِ اہلِ کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اُس غریب کا بھی احوال ہے۔ دیوان اس عزیز کا بھرا ہوا نظم کے جمیع اقسام سے ہے۔ یہ اس کے منتخب کلام سے ہے ◆

پیری میں اور بھی ہوئے غافل ہزار حیف — بے اختیار لے گئی ہم کو یہ خوابِ صبح
ولہ
ہوئی ہے بسکہ یہ فصلِ بہار دامن گیر — چلیں چمن سے تو ہوتا ہے خارِ دامنگیر
سمجھ کے رکھیو قدم دل جلوں کی تربت پر — مبادا ہو کوئی تیرا شرار دامنگیر
ولہ
آگیا خط پہ سرِ مو نہ گیا نازِ ہنوز — ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز
ولہ
ایک دن رو کے نکالی تھی وہاں کلفتِ دل — اب تلک دامن صحرا ہے غبار آلودہ
ولہ
زبس آئینہ رو ہے طفل حجام — نہیں بن دیکھے اُس کو دل کو آرام
ولہ
جو دیکھیں انگلیاں وہ گوری گوری — بنا خورشید پانی کی کٹوری
وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا — اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا
ملا جب آئینے کو ایسا نائی — بنائی چار ابرو کی صفائی
نہ کھینچے نامۂ مو اُس کی تمثال — کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال
سنے ہی مصحفی اب تو بھی فی الحال — منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

۷۔ محبّت

محبّت تخلص، نواب محبت خاں نام۔ خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ہیں، حسب و نسب کی طرف سے کثرت شہرت کے باعث نہیں محتاج بیان کے ہیں۔ جوان خوش ظاہر و خوش رو ہیں، اور خوش اختلاط و خوش خو حُسن خلق سے معمور، اور مروت و جوانمردی کے ساتھ

مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث انہوں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا، اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبع بیگانہ خو کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا۔ جمیع اقسام نظم میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور اصلاح سخن کی میرزا جعفر علی حسرت تخلص سے لی ہے۔ معاصرین اپنے میں مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے، اور روشن طبیعتوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔ قصہ حسی پنو کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مستر جانسین بہادر کے انہوں نے نظم کیا ہے، اور نام اس مثنوی کا اسرار محبت رکھا ہے۔ بعد نواب حافظ رحمت خاں کی شکست کے، جو لکھنؤ میں آئے، تو اسی ایام سے بس طور بود و باش کی وہیں ٹھہرائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت اعزاز و اکرام کیا تھا، اور مشاہرہ بھی معقول کر دیا تھا۔ بالفعل، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اُسی شہر میں بود و باش رکھتے ہیں، اور مضامین تازہ کی ہمیشہ تلاش رکھتے ہیں۔ دیوان میں ان کے نظم کے سب اقسام ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب کلام ہیں ؛

جب تلک وہ بُت خود کام نہیں آنے کا
دلِ بیتاب کو آرام کو نہیں آنے کا

مجھ کو خطرہ ہے خدا یہ نہ کرے جو اُس کا
دیوے قاصد کہیں پیغام نہیں آنے کا

کیا خوشی کیجے یارو کہ وہ خورشید لقا
صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا

ولہ

کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا
یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستمگاری کا

دیکھا اک جھڑکی میں اے یار کوئی بھی ٹھہرا
کیا ہی اغیار کو دعوی تھا تری یاری کا

ولہ

قید ہو بیٹھے ہو ادونوں جہاں سے آزاد
میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا

ولہ

دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا تک
میر اغبار کیجو برباد اس طرح کا

ولہ

مذکور جو محفل میں ہوا وحشی کسی کا
سنتے ہی ٹھکانا نہ رہا ہوش کسی کا

ولہ

شب کہ مجلس بیچ وہ غارت گر ہر خانہ تھا
تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا

ولہ

جس گھڑی گلگر مرے تو جلوہ فرمانے لگا
غنچہ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا

یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا
تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے
تیری گلی سے دل افگار جو گیا سو گیا
تو اُس کے گھر کو تو ہنستا ہوا چلا اے دل
دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھ کو کیا
چشم حیراں سے کہاں دل کو ملے لذت دید
منزل اوّل ہی ابھی عشق کی اے تاب و تواں
دل دیں گے رونمائی دستور ہے ہمارا
اللہ رے تکبر سنتا نہیں سخن بھی
جاتے ہیں جلد پھینکئے توسن کو مر کے ہم
غیر کو یاد تو زنہار نہ رکھ اے پیارے
دید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں
دل خشک ہے کہاں سے بہیں اشک چشم سے
نزع میں دم ترے پاس آنے کا ہم رکھتے ہیں
آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں
سرخیِ اشک کبھی اور کبھی زردیِ رو
بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی جو مجھے
ساقی گھٹا ہیں جو بستی نظر پڑی
بوسے کی بھی عوض نہ خریدی یہ جنس ہائے
یا تھا فلک پر اُس کا دماغ اب ہے خاک پر
تمنا یا سے ہیہات کہنے میں نہیں آتی

وله آج چہرا مرا بحال ہوا
وله عدم کے کوچہ سے اے یار جو گیا سو گیا
یہ ہے وہ قہقہہ دیوار جو گیا سو گیا
وله اُس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
مری آنکھیں جو تجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا
چھوڑ جاتے ہو تم افسوس نہیں مجھ کو کیا
وله کیا کیجئے یہی کچھ مقدور ہے ہمارا
یہاں تک وہ بت غیرت مغرور ہے ہمارا
کیا کیجئے محبت گھر دور ہے ہمارا
وله بھول جا مجھ کو بھی لیکن یہ مری بات نہ بھول
وله اُڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانے میں
فوارہ تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں
وله دم میں دم جب تلک اپنے ہے یہ دم رکھتے ہیں
یہ جو جھوٹ ہو دی تو ہم بات قلم کرتے ہیں
وله تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھ کو
وله تو اٹھا لیجیو اے بار خدایا مجھ کو
وله یاد آئی مے وہیں وہیں مستی نظر پڑی
اُس کو متاع دل مری سستی نظر پڑی
دل کی عجب بلندی و پستی نظر پڑی
وله غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

مخمّس

کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا
پر مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا
ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
درد دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا

یوں ہی آ نکلے تھے محفل میں تمہارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو
آ کے دیکھ چکے سب یہ اشارے ہم تو
آ لگے گور کے اس غم سے کنارے ہم تو
تو بھی غیروں سے میاں تم نے کنارا نہ کیا

ولہ

ساری شب رہتی ہے مجھ میں اور دلبر میں خوشی
لیک حرف ناز اُس کا سُن نہیں رہ جی میں جی
گر اُسے میں جام بھر بھر دوں ہوں وہ مجھ کو کبھی
چھیڑتا ہوں جب میں اُس کو تب یہ کہتا ہے ابھی
پاس سے ہم تیرے ان باتوں سے اب اُٹھ جائنگے

مثنوی

کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات — اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات
تو مضموں کرکے اس قصہ کا معلوم — یہ ہی منشور کر تو اس کو منظوم
یہ بات اتنے سنتے تجھ سے کہی ہو — کہ مشق اس کی بہت تجھ کو رہی ہے
تجھے اس عشق کے ہیں کار معلوم — محبت کے ہیں سب اسرار معلوم
پیا ہے تو نے بھی جام محبت — سراپا تو ہے ہم نام محبت
ترے اشعار سن کر سب سخنداں — محبت کا اُسے کہتے ہیں دیواں
سراپا کیا لکھوں اُس شمع رو کا — کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں ہوئے سے تھے عنبر آلود — کہ جیسے شمع کے شعلہ پہ ہو دود

دوپٹا چاند تاری کا زری باف — جو اوڑھے تھی گر اپنی پٹیاں صاف
سما ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر — شبِ دیجور میں چمکے ہیں اختر
گُندھی چوٹی نظر اس شکل آوے — کہ جوں مارِ سیہ پھریں دکھاوے
بہت سے تھا دوں کا اُس میں مسکن — اچنبا ہے کہ اک سانپ اور کئی من
نگہ بدرِ فلک کی اُس جبیں پر — اک ابرِ سیہ جیسے ہو مُنہ پر
وہ دندان آب دار اُس سیم بر کے — کہ سوراخ اُن سے ہیں دل میں گُہر کے
کروں کیا خوبیِ لب کی میں تقریر — قیامت اُس پہ تھی مسّی کی تحریر
تبسّم میں نظر اس رنگ وہ آئے — کہ غنچہ جیسے نافرماں کا کھل جائے
زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر — سخن ہو جائے گم میری زباں پر
کوئے کیا کیا جھکاوے عشق اُس آہ — سیہ جیسے چاہِ زنخ کی اُس کے ہو چاہ
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی — وہ ہے گویا صراحی دار ہوتی
حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ — کہ جوں خوش خط لکھیں سُرخی سے اللہ
بھلا دوں کس سے نسبت ان کچوں کو — جو میدانِ حسن کے سے لے گئی گو
عیاں وہ گلشنِ خوبی میں ہیں یوں — کہ جیسے دو انار اک شاخ میں ہوں
اگر دیکھے اُنھیں نامردِ ذاتی — عجب کیا وہ بھی اپنی کوٹے چھاتی
جو وصف اُس ساقِ سیمیں کا سنے ہے — بہ حسرت شمع رو رو سر دُھنے ہے
قدِ موزوں وہ جب اپنا دکھا جائے — اور اُس کے فندق پا تک نظر آئے
تو حیرت سے ہوں یہ سب کو پڑے دیکھے — بنِ شمشاد میں غنچے نہ دیکھے
جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت — کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت
جو ہوئے تک فرشِ گل پر گرم رفتار — رگِ گُل پشتِ پا سے ہو نمودار

۸۔ منت

منت تخلص، میر قمر الدین نام۔ شاہ جہان آبادی۔ سلسلہ ان کے نسب کا ماں کی طرف سے سید جلال بخاری کو پہنچتا ہے۔ وہ سید جلال جنے بیٹے تھے سید عضد یزدی کے جن کا احوال مفصل تذکرہ کاشی میں لکھا ہے۔ قرابتوں کی تقریب اور پیوندوں کے سبب سے تربیت منت مذکور نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے گھرانے میں پائی ہے، اور کیفیت راہ طریقت و معرفت کی فخر العارفین مولوی فخر الدین قدس سرہٗ کی خدمت سے اُٹھائی ہے۔ عقدے فن شعر و شاعری کے میر شمس الدین فقیر تخلص کی فیض صحبت سے ان پر کھلے، اور میر نور الدین نوید تخلص کی برکت مجالست سے دقیقے سستی و چستی نظم کے ہوئے۔ صفائی بندش و حسنِ بیان میں فی الحقیقت اُستاد، اور موشگافیِ معنی میں قلم اس کا رشکِ خامۂ بہزاد۔ زبان فارسی میں کلکِ عنبر سلک نے ان کے بہت کچھ لکھا ہے۔ نظم و نثر ملا کے قریب لاکھ بیت کے کلیات ان کا ہے۔ مثنویاں متعدد انہوں نے کہیں، اور کتابیں بیشتر تالیف کیں۔ چنانچہ شکرستاں کر کے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے، اور جواب اگر گلستاں کا کہیں تو کیا مقدور ہے۔ سنہ ۱۱۹۱ھ گیارہ سو اکانوے ہجری میں ویرانیِ شاہ جہان آباد کے باعث لکھنؤ میں ان کا آنا ہوا، اور میر محمد حسین فرنگی لقب کی بار فروشی کی سبب مشتاق ان کا وہاں ایک زمانہ ہوا۔ بعد چندے مربی گری سے میر مذکور کے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین بہادر کی سرکار میں توسل انہوں نے حاصل کیا، اور رفاقت میں صاحب مذکور کی کلکتے آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہسٹن جلاوت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبہ بنگ کے خطاب ملک الشعرا کا لیا۔ بعد ایک مدت کے رفیق یہ مہاراجہ تکیت رائے کے ہوئے، اور چند ایام زندگی کے اپنے طور پر بسر کئے۔ سنہ ۱۲۰۶ھ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ تکیت رائے واسطے کچھ سوال و جواب معاملات کے لکھنؤ سے کلکتے جو تشریف لائے، تو میر قمر الدین منت بھی ساتھ آئے۔ ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی، اور بغیر جان کے لئے وہ تپ نہ گئی۔ چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا،

اور تا رستخیز قیامت وہی مسکن ہوا۔ یہ خلاصۂ افکار اُس منتخب روزگار کا ہے ✦

خشک نالے ہو گئے بہنے سے دریا تھم رہا — چشم میں اپنے نہیں اک عمر سے کچھ نم رہا
مے کدہ سے ٹل گئے اہلِ ہوس پی پی کر جام — انگبیں وہ ہوں کہ اس پیرِ مغاں میں جم رہا

ولہ
کوتہ ہو اُس کی زلف سے دستِ صبا ہنوز — عقدہ ہوا یہ دل کا ہمارے نہ وا ہنوز

ولہ
گل نکلتے ہیں زمیں سینتی بہ رنگِ شعلہ — کون دل سوختہ جلتا ہے تہ خاک ہنوز

ولہ
گر نقشِ دوئی مٹائیں گے ہم — سچ کہیو کہ کیا کہائیں گے ہم
مصری سے وہ ہونٹ ٹک دکھاوے — کچھ گھول کے پی نہ جائیں گے ہم
اس آنے کا کچھ بھی لطف پیارے — ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم
آئینۂ دل جو تھا وہ ٹوٹا — کیا اب تمہیں منہ دکھائیں گے ہم

ولہ
سو کوہِ آتشیں کو چھاتی سے پیلتے ہیں — کچھ عاشقی نہیں ہے ہم جی پہ کھیلتے ہیں
دل ہم ستم زدوں کا ہے واجب الترحم — اس نیم قطرہ خوں پر سو زخم جھیلتے ہیں
خوانِ کرم پہ تیرے ہے سیر ایک عالم — ہم بے نصیب اب تک پاپڑ ہی بیلتے ہیں

ولہ
منت ایسے کو دل دیا تو نے — اے مری جان کیا کیا تو نے

ولہ
مدعی اُس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے — پھر تمنا کو یہاں مژدۂ پابوسی ہے
ہے مری طرح جگر خون ترا مدت سے — اے حنا کس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے
تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ پر منت — ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خو سی ہے

ولہ
کوئی اس بدمزاجی پہ تمہارے پاس کیا بیٹھے — ادھر ٹک ہم نے دم مارا اُدھر تم منہ بنا بیٹھے
یہیں سے ہمرہانِ قافلہ اپنی تو رخصت ہے — کہ اس وادی میں ہم تو ضعف سے جوں نقشِ پا بیٹھے

قطعہ
کھڑے رہیے جو اُس کی بزم میں تو یوں لگو کہنے — دکھاتا ہے یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کھڑا بیٹھے
جو اتنی بات سُن کر بیٹھ جاویں تو لگے کہنے — ہنسی سے کہتے ہی اک بات کے بس آپ آ بیٹھے
نہ آوے باز یہ بندہ تو منت بدکہانے سے — تکلف برطرف گر ساتھ اُس بت کے خدا بیٹھے

کہاں ہم کو غرض غم دل رو سے ہے	وله	گرہ زیر لب غنچۂ آرزو سے ہے
قدم رکھ گیا کون سینہ پہ اپنے		گُل داغ میں آج مہندی کی بو ہے
سناتا تھا میں حال دل اُس کو منت		کہا چل بے بیاں سے یہ کیا گفتگو ہے
آہو سے تری چشم کی کب چھوڑیں یہ تشبیہ		جب تک کسی ساغر کو تو آنکھیں نہ دکھاوے
اُٹھ جائے کسی کے جو دل صاف سے پردا		پھر آئینہ دنیا میں کبھو مُنہ نہ دکھاوے
بندے کو خدا کے نہیں جز دل شکنی کام	وله	کیا سنگ ہے دل شیخ کا اللہ سے پاوے
منت یک بار عشق سے توبہ کر	رباعی	چارو ناچار عشق سے توبہ کر
اب تک مردودِ دین و دنیا رہنا		آجانے دے یار عشق سے توبہ کر
منت جوں شمع دل جلا جاتا ہے	دیگر	روکا کب غم کا ولولا جاتا ہے
کیا جانئے کیا خلش ہے سینہ میں آج		ہر سانس کے ساتھ جی چلا جاتا ہے
منت اے جان ان بتوں کو مت پوچھ	دیگر	مت کھوا یمان ان بتوں کو مت پوچھ
ان باتوں پر پتھر پڑیں تیری ظالم		اللہ کو مان ان بتوں کو مت پوچھ

باب النون

۱۔ ناجی

ناجی تخلص، نام اس کا محمد شاکر تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ شاہ نجم الدین آبرو تخلص کا معاصر تھا۔ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے، اور بطور قدما کے طرز ایہام میں کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا، اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے، اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے لیکن ازبسکہ غیر مروج طرز ایہام ہے، کلام ان کا نامقبول طبائع خاص و عام ہے۔ یہ منتخب اوراق اُس کہنہ مشاق کا ہے۔

قوس قزح سے چرچا کرتا ہے تجھ بھوان کا	شاید کہ سر پھرا ہے اب پھر کر آسمان کا

نہ پوچھو خود بخود عارض خورشید کی خوبی	ولہ	لیا ہے واد حسن ماہ مہ رویوں سے کر چندہ
مجھ کو باتوں میں لگا معلوم نیں کیا کیا گیا	ولہ	لے چلا جی کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا
تری نگاہ کی کثرت سے اسے کماں ابرو	ولہ	ہمارے سینہ میں تودا ہوا ہے تیروں کا
مت گرا نہ او دام زلف سے دل	ولہ	بال باندھا غلام ہے تیرا
سخن سن اُس بت کا فرادا کا	ولہ	جیا ہوگا کوئی بندہ خدا کا
رنگ تیر اگندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف	ولہ	ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنی خورد و خواب
دی ہے دریا اوپر مجھے مچھی	ولہ	لا اُتارا ہے میں اُسے کس گھات
محبت سوں علیؑ کی دیکھ ناجی	ولہ	ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد
یکبار جو بغل میں لوں اُس سرو قد کے تئیں	ولہ	بالا بتاؤں خضر کی عمر ابد کے تئیں
عاشق کو روتے دیکھ چڑھا مت بھواں کے تئیں	ولہ	برسات میں اُتار رکھے ہیں کماں کے تئیں
زلف کیوں کھولتے ہو دن کو صنم	ولہ	مکھ دکھایا ہے تو مت رات کرو
ہی غرض ملنے میں نہ اُلفت کچھ اس بے درد کو	ولہ	پوچھتا ہے کان زر عاشق کے رنگِ زرد کو
غم نہیں گر دلبری سی دل کو لے جاتا ہے وہ	ولہ	پاس میرے تب تو آتا ہی جو دل پاتا ہی وہ
ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہی	ولہ	یہ تو طالب زر کے ہیں اور یہاں خدا کا نام ہے
وظیفہ راگنی کے سُر میں زاہد کفر ہے مت پڑھ	ولہ	نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہی
ہوا جب آئینہ میں جلوہ گر میں تب لیا بوسا	ولہ	جو آیا اپنے قابو میں تو پھر منہ دیکھنا کیا ہی
انا الحق بولنے لگتا ہی اُس کے زخم کا بسمل	ولہ	کٹاری آبدار اُس شوخ کی منصور خانی ہی
اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں	ولہ	عارضی میری زندگانی ہے
تصور سی ترے رخ کے گئی ہی نیند آنکھوں سے	ولہ	مقابل جس کے ہو خورشید کیونکر اُس کو خواب آوے

۲- نعیم

نعیم تخلص، نعیم اللہ نام ہے۔ وطن شاہ جہان آباد کا معاصر محمد حاتم حاتم تخلص کا تھا۔ چنانچہ اکثر شاعروں میں گفتگوئیں طنز و ایما کی ان کے درمیان آئیں ہیں، اور مکرر غزلیں انہوں نے باہم لڑائیں ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی، اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہو	بدتر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

جب دورہ پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انہوں نے بھی مطلع غزل یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے	لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

غرض نعیم مذکور نے مرتے دم تک دلّی نہ چھوڑی، اور شاہ جہان آباد ہی میں سیر جنت النعیم کی کی۔ ایک دیوان مختصر زبانِ ریختہ میں اس کہن استاد سے ہے۔ یہ اس کے طبع زاد سے ہے ؎

اس وقت تک اے یارو گفتار نہ کیجے گا		اُس فتنۂ عالم کو بیدار نہ کیجے گا
احوال سِرا اُس کے کہنے لگا وہ ظالم		اب جائیے بس زیادہ تکرار نہ کیجے گا
خیال کر کے ترے مو کمر کو روتا ہوں	ولہ	وہ کیوں نہ رووے پڑی جس کے بال آنکھوں میں
دیکھ آئینہ خانے میں گر تجھ کو نہیں باور	ولہ	تجھ سے تو جہاں میں بھی دلدار بہت ہوں گے

باب الواو

۱- ولی

ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام، دکھنی۔ وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے۔ شاعر بلند مقام تھا۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے۔ اور نظم ریختہ کو سرزمین دکھن میں رواج اس نے دیا ہے۔ شعراء دکن میں مشہور و ممتاز ہے، اور اپنے معاصروں میں سربلند اور سرفراز ہے۔ عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان کی طرف آیا، اور میاں گلشن کے فیض خدمت سے فائدہ انواع

واقسام کا اُٹھایا۔ خوب خوب داد تلاش معنی کی دی، آخر اس بیتِ بے معنی وجود سے راہ کاشانۂ عدم کی لی۔ یہ اشعار اُس سر بلند افکار کے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں ❖

پھر میری نبض لینے کو عیسیٰ وہ نہ آیا		شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں	وله	کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں		تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
گذر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا	وله	ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا
صحن گلشن میں جب خرام کیا	وله	سروِ آزاد کو غلام کیا
پھرتے ہیں سیہ مست ہو شمشیر نظر لے	وله	بن بند اُن انکوں کو پکڑ کون سکے گا
ہے نقش کناری کا ترے جامے کے اوپر		دامن کو ترے ہاتھ لگا کون سکے گا
جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا	وله	عالم میں اُس کا نانو جواہر رقم ہوا
نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہے جس نے دل		وہ دائرے میں عشق کے ثابت قدم ہوا
خدا نے منہ پہ ترے بابِ حسن باز کیا	وله	قدِ بلند کو تیرے تمام ناز کیا
تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا	وله	سر اوپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا
حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد	وله	طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
حاکمِ وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بدخو		دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں		درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ
شغل بہتر ہے عشق بازی کا	وله	کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام		ذکر تجھ زلف کی درازی کا
دل صد پارہ تجھ پلک سوں بندھا	وله	خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا
آیا ہے نقل لینے ترے منہ کی تاب کی	وله	تارِ خطوط سیتی بنا مسطر آفتاب کی
بجا ہے گر شہیدِ سروقد کو	ول	بناویں چوب سے طوبےٰ کی تابوت

نکلا ہے بے حجاب ہو بازار کی طرف	ولہ	ہر بوالہوس کی گرم ہوئی ہے دکان آج
کیا ہے رفع مرے دردِ سر کو رونے نے	ولہ	ہوا ہے حق میں مرے خون دیدہ صندلِ سرخ
رحم بے جا ستم برابر ہے	ولہ	تو رقیباں اوپر کرم مت کر
جو آیا مست ساقی جام لے کر	ولہ	گیا یکبارگی آرام لے کر
میں اس کو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ		جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر
میں نے جانا تھا کہ تو نادان ہے	ولہ	دل دیا تھا تجھ کو دانا بوجھ کر
ہوں گرچہ خاکسار و لے از رہِ ادب	ولہ	دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
لبِ دلبر پہ جلوہ گر ہے خال	ولہ	حوضِ کوثر پہ جوں کھڑا ہو بلال
صنم کے لعلِ لب وقتِ تکلّم	ولہ	رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم
نہ جا آنکھوں میں۔ آ بجھ دل میں اے شوخ	ولہ	کہ ہے خلوت میں اس کی خوفِ مردم
ٹک ولی کو صنم گلے سے لگا	ولہ	تجھ کو ہے بندہ پروری کی قسم
اس کی دہنِ تنگ کی تعریف کو میں نے	ولہ	صنعت سے ولی دیدۂ عنقا پہ لکھا ہوں
خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں	ولہ	بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کروں
کیا لکھوں تجھ قد کی خوبی سرو عریاں کے حضور		خود بخود رسوا ہے اس کو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گل رنگ کا		جامہ زیبوں کو بہ رنگِ جامۂ دیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب		زیورِ لب ذکرِ سبحان الذی اسریٰ کروں
آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کی ولی		سرو قد کو دیکھ سیرِ عالمِ بالا کروں
یک بار اگر بات مری گوش کرے تو	ولہ	ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو
غیرت سے کرے چاکِ گریبانِ دلِ پرخوں		گر گل کی حمائل کو ہم آغوش کرے تو
اے جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے		ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو
ایسے نصیب میرے کہاں ہیں ولی کہ آج	ولہ	اس گل بدن کو اپنے گلے ہار کر رکھوں

خوش قد اس دل کو بند کرتے ہیں	وله	نام اپنا بلند کرتے ہیں
ای ساحری تو دیکھ مری ساحری کے تئیں	وله	شیشہ میں دل کو بند کیا ہوں پری کے تئیں
صحبت غیر میں جایا نہ کرو	وله	دردمندوں کو کڑھایا نہ کرو
اک دل نہیں آرزو سے خالی	وله	برجا ہے محال اگر خلا ہے
کیونکہ کپڑے رنگوں میں تجھ غم سے	وله	عاشقی میں لباس ہوتا ہے
رہیں گے خاک ہو تیری گلی میں	وله	وفاداری ہماری اس قدر ہے
دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن	وله	باعثِ خمیازۂ آغوش ہے
اب خلاصی عشق سے ممکن نہیں		دامِ دل زلفِ دودامی پوش ہے
نشہ بخش عاشقاں وہ ساقیِ گلفام ہے	وله	جس کی آنکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے
مفلسی سب بہار کھوتی ہے	وله	عشق کا اعتبار کھوتی ہے

ترا منہ مشرقِ حسن انوری جلوہ جمالی ہے	وله	لبیں جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے	وله	چمنِ حسنِ پریرو کا تماشائی ہے
گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع		جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے
شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور		گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق		کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے	وله	زخمی ہو شکار کیونکہ جاوے
چھوڑا ہے شوخ طرزِ خودکامی	وله	مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی
جب تک نہ ملے شرابِ دیدار	وله	آنکھوں کا خمار کیونکہ جاوے
تجھ لب و زلف کے تماشے کو	وله	چل۔ کہ آئے ہیں مصری و شامی

۲- ولی

ولی تخلص، میرزا محمد ولی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بھتیجے ہیں شاہ اسرار اللہ صاحب ارشاد کے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے احوال اس خجستہ کردار کا کہ "جوانِ آزاد حال اور دوست ہے اس خاکسار کا، ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر جائے قرار رکھتے تھے، اور بیشتر شغل اشعار، زبان ریختہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے، اور دیوان بھی ان کا منتظم ہوا ہے۔" یہ منتخب افکار اُس ستودہ اطوار کا ہے۔

نشۂ مے سے مرا پژمردہ دل گلشن ہوا — یہ چراغِ مردہ فیضِ آب سے روشن ہوا

وله

دل تجھے منظور ہو اُس کا اگر دیکھنا — جان سے دھو ہاتھ کو تب تو ادھر دیکھنا

زلف کو ہے کھولتا اپنے وہ منہ پر ولی — ملتی ہے آپس میں اب شام و سحر دیکھنا

وله

آہ کا اُس کو کچھ اثر نہ ہوا — میرے اس نخل میں ثمر نہ ہوا

وله

بے کسی پر مری کہے کوئی — تجھ بن اے نالہ نوحہ گر نہ ہوا

وله

صحبتِ نیکاں کرے دل میں بدوں کے کیا اثر — قند کب شیریں کرے ہوئے اگر بادام تلخ

کیا تمنا اُس شکر لب سے تو رکھتا ہے ولی — ہو گیا فرہاد کا شیریں سے آخر کام تلخ

وله

تھی آشنا نہ تیغ سے اُس کی کمر ہنوز — ہم تب سے ہاتھ پر لئے پھرتے ہیں سر ہنوز

آنکھیں بھی انتظار میں پتھرا گئیں ولی — قاصد پر اُس صنم کی نہ لایا خبر ہنوز

وله

میری زبانِ تر سے نہ ہو تازہ کام خشک — کب سیر آب تیغ سے ہووے نیام خشک

وله

کبھی جو زلف اُٹھا دے تو منہ نظر آوے — اسی اُمید میں گذری ہے صبح و شام ہمیں

وله

زندگی کی اُس نے کچھ لذت ولی جانی نہیں — جس کے دل میں دردِ عشقِ دلبر جانی نہیں

وله

چاہے کیونکر کہ یہ جی تن سے نکل جانے کو — پھر نہ آیا جو گیا اُس کی خبر لانے کو

وله

عیاں گر کروں دل کے سوزِ نہاں کو — لگے آگ جوں شمع میری زباں کو

کبھی درد کی چاشنی کو نہ بھولے		ہما کھاوے بیسکے اگر استخواں کو
حد سے زیاد رشتۂ الفت ہی مختصر	وله	ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑے اب جدا گرہ
ہجر کی مارے ہی ڈالے ہے شبِ تار مجھے	وله	کب دکھاوے گا خدا صبح رخِ یار مجھے
دانۂ خال دکھا کر گیا تو نے صیاد	-	زلف کے دام میں آخر کو گرفتار مجھے
جس جگہ عشق رخش تاختہ ہے	وله	وہاں رستم حواس باختہ ہے
نگہِ گرم سے پری رو کے		شیشۂ دل مرا گداختہ ہے
جو اس لعل میگوں سے مدہوش ہووے	وله	اُسے ہر دو عالم فراموش ہووے
بندِ قبا چمن میں جو وہ یار وا کرے	وله	لے برگ گل کو ہاتھ میں پنکھا صبا کرے

بابُ الہاء

۱-ہدایت

ہدایت تخلص۔ شیخ ہدایت نام اس مرد کا ہے۔ شاہ جہان آبادی۔ معتقد اور شاگرد خواجہ میر درد کا ہے۔ ایک مثنوی انہوں نے بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے۔ اور داد مضمون تراشی کی دی ہے۔ شاعر فصیح بیان ہے، اور ناظم شیریں زبان۔ دیوان مختصر زبان ریختہ میں طبع زاد سے اس کے ہے، اور گم شدگانِ راہ معنی کو بیشتر ہدایت اس کہن استاد سے ہے۔ یہ منتخب کلام اس شاعر بلند مقام کا ہے۔

جب لوں ہوں ترا نام ٹپک پڑتا ہے آنسو		جس طرح کہ سُمرن کا ڈھلک جاتا ہے منکا
جسے کہ زلف سیہ نے تری ڈسا ہوگا	وله	غرض وہ مر ہی گیا ہوگا کیا جیا ہوگا
جوں غنچہ ترے وصف میں ہوں سر بہ گریباں	وله	ہے منہ میں زباں پر نہیں مقدور سخن کا
نہ رحم اُس کے ہے جی میں نہ دل میں اپنے صبر	وله	ہماری گذرے گی کیونکر الٰہی کیا ہوگا
ہو گیا ہوں میں زرد جوں خورشید	وله	ظاہرا وقت ہے اخیر مرا
تمام صبر و دل و دیں تو یار لوٹ گیا	وله	نہ خلف وعدہ کیا پر ترا نہ جھوٹ گیا

بلا ہی زور ہے اس دختِ رز کا ای ساقی — خمار جس کا مرے ہاتھ پاؤں کوٹ گیا
ملا ہے جا کے یہ آخر کو سادہ رویوں سے — اگرچہ آئینہ تھا دل پہ ہم سے چھوٹ گیا
ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں — کسی نے خوب کہا ہے موا سو چھوٹ گیا

ولہ
آتش سے داغِ دل کی سراپا میں جل گیا — گلزار ہووے کیا کہ بدن سارا پھل گیا
رووے ہے کیا جوانی پہ اپنی کہ بے خبر — شب کیا گذر گئی ہے کہ اب دن بھی ڈھل گیا
لب پر ہزار حرفِ شکایت کا تھا ہجوم — مکھڑے کو دیکھتے ہی پہ کچھ دل بہل گیا

ولہ
ہر لختِ دل سے گلے کا مرے ہار ہو گیا — گل تھا پر اپنی چشم میں یہ خار ہو گیا
ہے کس کے جی میں خواہشِ سیرِ چمن یہاں — سینہ تمام داغوں سے گلزار ہو گیا
آیا ہوں تنگ کشمکشِ دامِ زلف میں — یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا
بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں — میں اتنی بات کہتے گنہگار ہو گیا
کچھ ان دنوں ہے حال ہدایت ترا تباہ — کیوں میری جان کیا تجھے آزار ہو گیا

ولہ
عالم کو تیری چشم نے بیہوش کر دیا — جس کی طرف نظر گئی مدہوش کر دیا
جاتا رہا ہوں آپ بھی میں اپنی یاد سے — کیا جانئے کہ کس نے فراموش کر دیا
مجلس میں اس کی رات ہدایت نے سوزِ دل — یہاں تک کہا کہ شمع کو خاموش کر دیا

ولہ
نے جم رہا جہاں میں نہ یہ جام رہ گیا — مردوں کا اس جگہ میں مگر نام رہ گیا
کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک — پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا
دیکھا جو تیرے چشم و دہن کو تو شرم سے — منہ اپنا لے کے پستہ و بادام رہ گیا
آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بو نسیم — رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا
کیا دن تھے وہ بھی آہ ہدایت کہ جن دنوں — راتوں کو اپنے پاس وہ گل فام رہ گیا
مدت ہوئی ہے اب تو ملاقات بھی نہیں — آنے سے بلکہ نامہ و پیغام رہ گیا

ولہ
اک دن بھی مہربان نہ وہ بے وفا ہوا — اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

ہر ایک دانۂ انگور یہاں شراب ہوا	ولہ	ولے یہ آبلہ اپنا نہ کامیاب ہوا
نہ صحنِ باغ میں لگتا ہے جی نہ صحرا میں		ہوا ہوں آہ میں یارب کس انجمن سے جدا
دیکھ اُس کی چشمِ مست کو دل تو بہک گیا	ولہ	بس میری جان دو ہی پیالوں میں چھک گیا
دیکھا نہیں ہے ہم نے ہدایت کو ان دنوں		شاید کسی جگہ پہ دل اُس کا اٹک گیا
عشق میں خوباں کے ہے طرزِ ستمگاری بہت	ولہ	آہ دلداری ہے کم یہاں اور آزاری بہت
مار ڈالا ہند کے کافر اداؤں نے ہمیں		حُسن میں ان کے نمک اور طرح داری ہے بہت
نہ ملے کاررواں سے ہم اے وائے	ولہ	گرچہ کتنا جرس پکار رہا
یار ہے ہم میں ہدایت جلوہ گر	ولہ	جس طرح ہو گوہرِ یکتا میں آب
پر نہیں معلوم ہرگز آپ کو		آب میں دریا ہے یا دریا میں آب
تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات	ولہ	روتے روتے ہی گذری ساری رات
دل تو سمجھا ہے سمجھتا ہے کبھو	ولہ	پر ہدایت چشمِ تر کا کیا علاج
کٹتی ہی نہیں یہ ہجر کی شب	ولہ	یارب کیا آج سو گئی صبح
تو نے گر قتل کیا ہم کو صنم خوب کیا	ولہ	ہاں میاں سچ ہے کہ ایسے ہی گنہگار تھے ہم
قیس ودں مر گیا فرہاد کی وہ شکل ہوئی		آہ اس کوہ و بیاباں میں کئی یار تھے ہم
تم نہ فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو	ولہ	اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو
عصا لے ہاتھ آئی سُن تجھے گلشن میں آئی ہے	ولہ	یہ نرگس باوجود اس کے کہ ہے معذور آنکھوں سے
چولی مسک رہی ہے اور آنکھیں ہیں رسمسی	ولہ	سچ کہیو ہم سے رات پیاری کہاں رہے
کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سے		گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یہاں رہے
کیا خاک کو مری کہیں گلشن میں جا نہ تھی	ولہ	پر چشم تجھ سے ہائے مجھے یہ صبا نہ تھی
سیرِ چمن ہوا وے وصحبت وطن مر		ایسی گئی کہ ہم سے گویا آشنا نہ تھی
گلشن کو دوستی کے ہیں دیکھا چمن چمن		جز بوئے خونِ دل کہیں بوئے وفا نہ تھی

ضعف سے بیٹھا ہیں جوں نقشِ قدم تو کیا ہوا	ولہ	گردباد آسا مری طینت میں ہے آوارگی
ہووے جب صد عیش و عشرت ہم کو تیرا دید ہے	ولہ	ل گئے جس دن گلے تیرے اُسی دن عید ہے
دل مرا کیوں کر ہو غافل گور سے	ولہ	گھر نظر آتا ہے اپنا دور سے
آنکھ سے آنسو کبھو تھمتا نہیں		چشم بھی کیا کم ہے یہ ناسور سے
دل نہ کر تو شکوۂ جورِ بتاں		فائدہ کیا یار اس مذکور سے
گر نت یہی جور اور جفا ہے	ولہ	بندے کا بھی اے بتاں خدا ہے
غرض یہی ہی مجھے اشک کے بہانے سی		کہ مہرباں ہو وہ یارب کسی بہانے سے
برنگِ اشک اُسے آبرو ہی دنیا میں		جو اپنے گھر میں ہی محفوظ آب و دانے سے
وہ کیا کرے کہ محبت کا اقتضا ہی یہی		وگرنہ فائدہ اُس کو مرے ستانے سے
کہیں جو مہر و وفا ہو جہاں میں یا اخلاص		الٰہی اُٹھ گئی یہ رسم کیا زمانے سے
میں چھوڑتا ہوں کوئی اُس کو مثل حلقۂ در		یہ سر لگا ہے مرا اُس کے آستانے سے
آنکھوں نے تری جس کے تئیں مست کیا ہے	ولہ	وہ شورِ قیامت ستی ہشیار نہ ہووے
آتا ہے مجھے رحم ترے حال پہ زاہد		اے وائے اُس اوپر کہ جو مے خوار نہ ہووے
کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر	ولہ	یاد میں زلف و رخ یار کے کیونکر گذری
دن گذرتا ہے مجھے روزِ قیامت سے دراز		رات گذری تو شبِ مرگ سے بدتر گذری
پختہ مغزانِ جنوں سے ہر کسی کو جنگ ہے	ولہ	جو ثمر پکا سو پامالِ جفائے سنگ ہے
عشق نے تیری مجھے یاں تک کیا ہے ناتواں		تا بہ لب آنا نفس کو راہ صد فرسنگ ہے
ان دنوں کچھ تو ہدایت ہو گیا ہے زرد سا		ظاہرا عاشق کسی پر ہے ترا کیا رنگ ہے
صدقے ترے گلعذار جی سے	ولہ	اک جی سے ہیں کیا ہزار جی سے
کھٹکے ہے تری مژہ ہر اک وقت		نکلا نہ کبھو یہ خار جی سے
گھر سے نکلے ہی تو جی ساتھ نکل جاتا ہے	ولہ	کوئی قامت ہے کہ یہ آہ دلِ محزوں ہے

زلفِ کج منہ اوپر جو چھوڑی ہے	وله	کیا یہ صید ہے نکلتا تھوڑی ہے
چشمِ خوں سے ہے دامنِ دریا		آستیں کس نے یاں نچوڑی ہے
شاخِ گل خم نہیں کسو نے کیا		ہاتھ معشوق کے مروڑی ہے
عمرِ کوتاہ کارِ عمر دراز		سانگ ہے بہت رات تھوڑی ہے
ایک وہ ماہ رو غائب ہے نظر سے ورنہ	وله	وہی تارے ہیں وہی ماہ وہی گردوں ہے
ہیں خوب سیر کی جگ میں ہر ایک بستی کی	وله	بنا خراب ہو بنیاد بت پرستی کی
ہمیں نشیبِ فرازِ زمانہ سے کیا کام		جو سر بلند ہیں اُن کو ہے فکر پستی کی
جی تو گلشن میں بھی نہیں لگتا	وله	کس کی مجلس سے ہم اداس گئے
جب سُنا میں نے غم ہدایت کا		سُنتے ہی بس مرے حواس گئے
جاؤں نکل میں دشت میں یا شہر میں پھروں		کوئی ایسی شکل ہو دی کہ ٹک جی بہل سکے
شہیدِ تیغِ ابرو ہے اسیرِ دامِ گیسو ہے	وله	ہدایت بھی تو کوئی زور ہی شہدا شکستہ ہے
ثابت کوئی اپنے جسم و جاں سے نہ پھرا	رباعی	یک شخص ہزار کشتگاں سے نہ پھرا
کوچہ تو ترا رہِ عدم سے نہیں کم		جو کوئی گیا سو پھر وہاں سے نہ پھرا
دلِ عہدِ شباب ہو چکا ہے باقی	رباعی	پیری ہے سو اس میں کیا رہا ہے باقی
ہوتا ہے کوئی دم میں یہ دور اب آخر		شب گذری ہے روز رہ گیا ہے باقی

باب الیاء

یقین

یقین تخلص، انعام اللہ خاں نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا اظہر الدین خاں، اور نواسا شیخ مجدد الف ثانی کا تھا۔ شاگرد میرزا مظہر جان جاناں کا مشہور اور منظورِ نظر مرزائے مذکور۔ اکثر یہ گمان باشندگان شاہ جہان آباد کا تھا، کہ یقین فنِ شعر و شاعری میں محض بے استعداد تھا۔ مرزا مظہر خود شعر کہتے تھے، اور نام اس کا داخل اشعا

کرتے تھے۔ مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا، اور نعش کی اس کو دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اُس عملِ شنیع کا گذرا تھا۔ اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں باپ کو اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اُس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا کو ہے، اور یقین گمانوں کا بالکنہ اس خالق ارض و سما کو ہے۔ بہر حال یقین مذکور کا کلام طبائع کے مرغوب ہے، اور اشعار اس کے جاں خراش و دل کوب۔ یہ ابیات آبدار اُس کا خلاصہ افکار ہیں ۔

نہ مرتا میں اگر صدقے ترے جانی کی کام آتا		اگر سنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا
میں تو ظاہر نہ کروں اُس کی جفا کو لیکن	وله	چھپ سکے کیونکہ یقین زخم نمایاں میرا
مجھے گر حق تعالیٰ کار فرمائے جہاں کرتا	وله	بتوں کو میں بہ زورانِ بیکسوں پر مہرباں کرتا
نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصرِ شیریں میں		جو میں ہوتا بجائے شیر جوئے خوں رواں کرتا
اگر مر کر نہ میں اُس شوخ کی خاطر نشاں ہوتا		خدا جانے وفا میرے کے حق میں کیا گماں کرتا
زباں فولاد کی ہو تب جوابِ کوہ کن دیوے		ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا
نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گذرا	وله	ہماری توبہ کرنے سیتی پیمانے پہ کیا گذرا
برہمن اپنے سر کو پیٹتا تھا دیر کے آگے		خدا جانے مری صورت سے بتخانے پہ کیا گذرا
یقین کب میرے سوزِ دل کی داد کو پہنچے		کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے پہ کیا گذرا
ہیں زخم مرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا	وله	اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سی کیا ہو گا
اگر تجھ کو زلیخا دیکھتی سب کچھ بسر جاتی	وله	تماشا ماہِ کنعانی کا اُس کو خواب ہو جاتا
سر پہ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا	وله	ہمیں ظلّ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سی نظارہ سی باز آیا		یقیں پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا
تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہے بستاں کی ہوا	وله	باغ سے یوسف کو رنگیں تر ہے زنداں کی ہوا

وله

نہ آبِ تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گر ملا سکتا — تو ایسے رنگ سے کب نقشِ شیریں کو بنا سکتا

یہ عشقِ سر شکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا — وگرنہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا

وله

تجھ آنکھوں سے اُتر کر دل نہ کرتا شور کیا کرتا — یہ شیشہ طاق سے گرتا نہ ہوتا چور کیا کرتا

وله

یہ دل ایسا خرابِ کوچہ و بازار کیوں ہوتا — اگر ملتا نہ اتنا گل رخوں سے خوار کیوں ہوتا

تری اُلفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

یقیں اُمید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے — اگر پرہیز تو کرتا تو یوں بیمار کیوں ہوتا

وله

گرا میں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا — مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا

نہ کہتی راز دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی — فضیحت کر کے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

وله

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند — برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

وله

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک — دیکھا سو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

وله

اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا — جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا

حسن کا عشق زلیخا سیتی کچھ چل نہ سکا — ورنہ وہ پاک گہر قابلِ بازار نہ تھا

دل مرا عشق کے دھڑکوں سی مؤا جاتا ہے — یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگر دار نہ تھا

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

وله

اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا — ملنے میں تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

ناصح جو یہ نصیحت بیجا ہے میں سُنی — معذور رکھیو مجھ کو مرا دل بجا نہ تھا

وله

خفیف مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا واعظ — کہ میں تو مست تھا اُس کو بھی کیا شعور نہ تھا

وله

تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانے سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

وله

بتاں کی مجھ سی خاطر جمع ہی بہیاں تک کہ کہتی ہیں — کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہی کیا قدرت

ہمارا شور سُن مجنوں کو بھولی طرز نالے کی — کوئی شیروں کے منہ پرنے بجا سکتا ہی کیا قدرت

وله

شیشۂ دل کے تئیں اپنی سنبھالے رکھ یقیں — پھر کرے گا کون اُس کی پھوٹ جانے کا علاج

سو جگہ سے دل گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح
زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح

جی نکل جاتا ہے میرا جب کبھو آتی ہے یاد
وہ قسم کھا کر اُسی ساعت مکر جانے کی طرح

ولہ
خار سے مژگاں کی جی ڈرتا ہے میرا بے طرح
رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کفِ پا کس طرح

فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھئے کیا ہو یقیں
اب کے چلتا ہے جنوں پر دل ہمارا کی طرح

ولہ
گرچہ شیریں شیخ کے ہے وجد میں آنے کا شور
پر قیامت بانگ ہوتا ہے مے خانہ کا شور

آہ و نالہ پر نہیں موقوف شہرت عشق کی
کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شور

ولہ
دل ہمیں کہہ کر چلا تھا اپنے جانے کی خبر
پھر نہ دی ہم کو کسی نے اُس دیوانے کی خبر

بلبلیں ہیہم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف
کچھ تو اُڑتی سی سنی ہے گل کے آنے کی خبر

نیں پہنچتا ضعف سے نالہ مرا صیاد تک
کون لے اس ناتواں کی اب دِوانے کی خبر

ولہ
توقع دے کے مت کہ نا اُمیدی کی سخن بس کر
جواب تلخ مت دی مجھکو ای شیریں دہن بس کر

جو لوہا جس نہ دی اُس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل
بہت کی تو نے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر

خال گورے منہ کا لیتا ہی مرے دل کو چرا
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پھرتے ہیں چور

ولہ
گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ خوبانِ چمن کیونکر
نہ کیجے چاک ناصح اس ہوا میں پیرہن کیونکر

کوئی محنت کوئی لذت اُٹھاوے یار سے کوئی
کھو اپنے تیئیں ضائع نہ کرتا کوہکن کیونکر

تعجب سخت رہتا ہی یقیں اس بات کا مجھ کو
کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کیونکر

ولہ
بعد مرنے کے ہوں میں گو زمیں غمناک ہنوز
گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز

ولہ
منہ پہ کھاتا ہی اسی طرح سے تلوار کہ بس
دل مرا عشق میں ایسا ہے جگر دار کہ بس

نزع میں دیکھ مجھے یار جھجک کر بولا
کیا بُری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس

آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
کیا خریدار یہ پایا ہے خریدار کہ بس

ولہ
آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس
ورنہ ٹک پھڑکیں تو ہو جاوے تہ و بالا قفس

تنگ تو کرتا ہی پر ہم جو کہیں جاتے رہیں
تو پڑا منہ دیکھتا رہ جائے گا تنہا قفس

ولہ
آج دیکھی ہی میں وہ لطف کی بیداد کہ بس
سر پہ آیا مرے اس طور سے جلاد کہ بس

جی میں آتا ہے تری جھپ کو گر دکھا دیجے آسے
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس

کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی جب چھوٹے
ہم ہوئے ایسے برے وقت میں آزاد کہ بس

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دیوانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس

ولہ
عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال
کس قدر پہلو چرب اپنی سے دکھ پاتی ہے شمع

اہل نور آہن دلوں کو دیکھ شرماتے ہیں سخت
دیکھ کر گل گیر کی صورت کو ڈر جاتی ہے شمع

ولہ
یہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینہ کا داغ
ہو گیا ناسور آخر یار دیرینہ کا داغ

ولہ
ہم تو مرتے ہیں گے اور بجھتا ہے الفت کا چراغ
دیکھیے پھر ہووے کب روشن محبت کا چراغ

خاندان درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقین
ہے مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

ولہ
ناصح سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

دل نہیں کھنچتا ہے بن تیرے بیاباں کی طرف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف

اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جام شراب
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف

سحر کے ڈورے جو سنتے تھے سو یہ دیکھے یقیں
دل کھنچا جاتا ہے اس زلف پریشاں کی طرف

آئینہ ہوتا ہے اس روئے درخشاں کا حریف
ماہ بن اور کون ہو خورشید تاباں کی طرف

ولہ
بہت جینے کی تدبیر اہل عرفاں کی نہیں لائق
کہ پینا آب حیواں شان انساں کی نہیں لائق

ولہ
رشک سے لاگے ہے پروانے کے جیسی تن کو آگ
لگیو اس فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ

جلتے تبوں سی کل ان نیلیا کپڑوں کے ساتھ
جی و دھڑکتا ہے مبادا لگ اٹھے دامن کو آگ

ولہ
چمن میں مجھ سی دیوانے کو لے جانے کا کیا حاصل
دکھا کر گل جنوں کو شور پر لانے کا کیا حاصل

جنہیں بالوں کی پھانسی دی ہو وہ ہرگز نہیں جیتے
جو زلفوں میں پھنسا دل اس کے غم کھانے کا کیا حاصل

ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہے تو دارو ہے
یہ سب کچھ سن کے ساقی بات پی جانے کا کیا حاصل

ولہ
ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھیڑ ان دونوں دھاروں کے تئیں
خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال

اس تغافل ساتھ میرے سامنے سے درگذر ۔ بے طرح پڑتا ہی حسرت کی نگاہوں کا وبال

وله

ہاتھ لگتا گر زبانِ مصر کو یہ آفتاب ۔ خواب ہو جاتا اُنہیں اُس ماہ کنعاں کا خیال

وله

مے ہوئی آخر رہی تدبیر غم کی ناتمام ۔ کس سے دل خالی کریں اب ہو چکا ملنا تمام

وله

تیری آنکھوں میں نشہ نے اس طرح مارا ہی جوش ۔ ڈالتے ہیں جس طرح بدمست مے خانے میں دھوم

وله

کروں کیونکر میں قید زلف سے چھٹنے کی تدبیریں ۔ پڑیں ہیں میرے ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں
ہمیں بھی بات کہ آتی ہی لیکن دل نہیں حاضر ۔ حیا سے دور ہی ناصح خموشی ساتھ تقریریں
یقیں اقبال ہاتھ آیا نہیں کچھ جی کے جانے سے ۔ نہیں ہووے گی ہم فرہاد کو سو بار سر چیریں

وله

چمن میں شاخ ہل جاتی ہی جیسے گل کے ہلنے سے ۔ لچک جاتا ہی دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں

وله

زخم بن مجھ کو کچھ اس لاگ سے مقصود نہیں ۔ عشق پھیکا ہی اگر داغ نمک سود نہیں
ہے اُسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار ۔ اور کسی طرح مرے زخم کا بہبود نہیں

وله

کرتا ہی کوئی یاروا اس وقت میں تدبیریں ۔ مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں
ناداں ہی جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاوے ۔ لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں
چہرے سے نکل کر سو لپٹے ہیں یقیں منہ پر ۔ اوراق طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں

وله

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں ۔ عبث سینے ہو اُس کو کیا رہا ہی اب گریباں میں
چمن کر بیچ کلیاں نے ہے جیسی شاخ سنبل کی ۔ ہوئی ہیں کس قدر دل جمع اُس زلف پریشاں میں

وله

بہار آئی ہی ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں ۔ چمن میں باندھنے پاوینگے اب کے آشیاں دیکھیں
اُٹھا اس منہ سے اے باد صبا گھونگٹ کی آنچل کو ۔ توجہ سے تری ہم بھی ٹک اک یہ گلستاں دیکھیں

وله

نہ کر خجل مجھے مہماں مرا نہ ہوا اے عشق ۔ کہ میری آنکھ میں آنسو جگر میں آہ نہیں

وله

تو نے ہم پر جو جفا کی ہے سوندکو نہیں ۔ بس پہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں
سینہ میرے میں تری عشق سے جو شاں ہی عسل ۔ کون ناسور سے ہے جو نیش کا معمور نہیں
دین و دنیا کی مجھے کام سے کھوتا ہے یقیں ۔ چھوڑ دوں عشق نہ باللہ کہ مقدور نہیں

خدا کی بندگی کہئے اُسے یا عشق معشوقی ولہ وہ نسبت ایک سے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے ۔ بیگانگی سے اُس کی کوئی آشنا نہیں

شیریں دہن بھی تلخ لگے بولنے یقیں ۔ اب چھوڑ دے نظارہ کچھ اس میں مزا نہیں

وہ کون دل ہی جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں ولہ اُس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

ترے سفر کی خبر سُن کے جان دھڑکوں سے ۔ جو پہنچوں مرنے کے نزدیک میں تو دور نہیں

کوئی بھی دیتا ہے لڑکوں کے ہاتھ شیشۂ دل ۔ یقیں میں غور سے دیکھا تو کچھ شعور نہیں

جس محبت میں نہیں ہی شور ہی وہ بے نمک ولہ کیا مزا ہے عشق کرنے میں جو رسوائی نہیں

بن یقیں کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب ۔ سیرِ گل سے جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں ولہ بندہ کو اعتراض خدا پر روا نہیں

اگر ستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے ولہ کہ اُس کا جی نکل جاتا ہی اُس کی ایک تنکن میں

گالی بھی پی گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں ولہ کیا کیا تری جفائیں ہم نے اُٹھائیاں ہیں

ایسا ورا ز دامن میں ہاتھ اُن کے آیا ۔ بختوں کی عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں

حق کو یقیں کے آخر بر باد مست دو یارو ۔ تم نے سخن کی طرزیں اُس کی اُڑائیاں ہیں

قامتِ رعنا سے تیرے بس کہ شرماتا ہی سرو ولہ دیکھ کر تجھ کو زمیں کے بیچ گڑجاتا ہے سرو

تم نہیں پامال یوں کرنے ہوا خواہش قامتو ۔ دیکھتے ہو قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو

کھڑا ہے سرو نپٹ بن بنا کے رعنا ہو ولہ جو یار پردے سے نکلے تو کیا تماشا ہو

نہ لانا تھا مرے گریہ کو شور پرائے عشق ۔ بُری بلا تو نے چھیڑی ہے دیکھئے کیا ہو

خونِ انصاف سے اتنا بھی زباں تر نہ کرو ولہ لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو

باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں غیر کا قتل ۔ اپنی بیداد کے مضموں کو مکرر نہ کرو

کوئی یہ چاند سا مُنہ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا ولہ گذر آتش پرستی سے یہ پروانے سی کہہ دیجو

ستا ؤمت یقیں کا دل کہ یہ خوباں کا مسکن ہے ولہ خدا جانے نہ کیا ہو اس کے مرجانے کو مت چھیڑو

جفا کے عذر میں اے ظالمو نہ دیر کرو ولہ
مری زباں پہ شکایت پہ مت دلیر کرو

جفا کی طرح میں اپنا بہل کیا ہے خوں
بتاں شہید کرو خواہ دستگیر کرو

خدا کرے کہ کہوں حق شتاب ثابت ہو
مت امتحان وفا میں یقیں کے دیر کرو

جو تو شراب پیے کیونکہ دل کباب نہ ہو ولہ
لگے جب آگ کہاں تک یہ زہرہ آب نہ ہو

خنک گذرتے ہیں ایام عشق داغ بغیر
کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو

دیوانے شہر سے یہاں آکے جی چھپاتے ہیں
خدا کرے یہ خرابہ کبھی خراب نہ ہو

بتاں کی بج نہیں حسنِ خلق و دامنِ پاک
وہ کیا مزا ہے جو معشوق بدشراب نہ ہو

یقیں بتاں کا ہوا جب سے بندہ تب سے ہی داغ
جو ہووے کافر اسے کس طرح عذاب نہ ہو

شہر میں تھا نہ ترے حسن کا سا شور کبھو ولہ
مصر اس جنس سے اتنا نہ تھا معمور کبھو

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح
خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

گو نہ کر وعدہ وفا دے مجھے اس کا تو جواب
مجھ سے ملنا بھی سجن ہے تجھے منظور کبھو

اپنی بیداد کی سوگند ہے تجھ کو اے مرگ
تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بیخوابی کے ساتھ ولہ
جمع آسایش کہاں ہوتی ہے بیگانے کے ساتھ

مفت نیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیں
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ

بہار آئی ہمیں کیا حکم ہے اے باغباں سچ کہہ ولہ
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ

نمک ڈالا ہے مجھ میں اے ہما شورِ محبت نے
کبھو کھائی ہیں تو نے اس مزے کی استخواں سچ کہہ

یقیں راتوں کو کر کر شور نیندیں سب کی کھوتا ہے
یہ کس بے درد سے سیکھا ہے فریاد و فغاں سچ کہہ

کچھ عمر نہیں باقی پیارے تو شتاب آجا ولہ
ڈرتا ہوں چھلک جاوے لبریز ہے پیمانہ

منہ اپنے کو گلشن میں رہنے نہ دیا گر تو
یہ سبزہ ترے خط کا ہے سبزۂ بیگانہ

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے ولہ
آ تو اے چرخ ٹک اس دلِ ناشاد کو دیکھ

کہاں تاثیر نالوں میں ہے اے مرغ سحر چپ رہ — وله — عبث صیاد کو ناخوش ہے کیوں کر رہا بس چپ رہ

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے — وله — بندگی سے جس نے خو کی ہو خدائی کیا کرے

وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے یقیں — دیکھئے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

کیا دل ہے اگر جلوہ گہ یار نہ ہووے — وله — ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

دل جل جو گیا خوب ہوا سوختہ بہتر — وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

دوانے کس طرح ناصح اٹھاویں ہاتھ طفلاں سے — وله — کہ ہے کشت جنوں سیراب ان کی سنگ باراں سے

یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے — وله — کون اس کوچہ میں جز تیر گذر کرتا ہے

اپنی حیرانی کی ہم عرض کریں کس منہ سے — کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے

عمر فریاد میں برباد گئی پھر نہ ہوا — نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے

جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہوویں میاں ہم سے — وله — و لیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

مرے آنسو بھی مارے ضعف کے اب چل نہیں سکتے — وله — کیا اے عشق مجھ کو ہائے ایسا ناتواں تو نے

خطا ہے مفت مر کر یار کیوں دیجے رقیباں کو — وله — ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اس کا جی چاہے — وله — تو کرنے دو اسے فریاد جتنا اس کا جی چاہے

نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جاویں چھوڑ بت خانہ — کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اس کا جی چاہے

نہیں کوئی کہ دشنام اس کی ہم تک یا دعا لاوے — وله — گیا ہے اب اس کو دیکھئے کب تک خدا لاوے

پڑے پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بیکس — مرے فرہاد اور پرویز و شیریں کو اٹھا لاوے

دیار حسن میں تو خوش ہوا پر یہ بڑی مشکل — کہ لٹ جاتا ہے وہاں جو کارواں حسن وفا لاوے

مناسب ہیں ہے شکوہ جور کا ان خوب رویوں سے — یقین کوئی بری باتوں کو اچھے منہ پہ کیا لاوے

زمیں پر جس طرح گرتا ہے سایہ سرو رعنا کا — وله — تری قامت کے آگے فرش ہو جاتی ہے رعنائی

نہیں ہوتے کبھو احباب کی خاطر ملول اس سے — خدا شاہد عجب ہے بد مصاحب سے یہ تنہائی

معاوضہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے — وله — کبھو کسو سے کوئی کیونکہ آشنا ہووے

اگر یہ خبر ہمیں یاد کر نہیں سکتا
یقیں ہوا مجھے قطرے سی اشک کے معلوم
خبر کیا پوچھئے مرغِ قفس سے آشیانے کی
گئے پکڑی شروعِ گلمیں اور پروازِ اوّل میں
موا جاتا ہوں مت اتنا بھی کس کر باندھ بالوں کو
زنجیر میں بالوں کے پھنس جانے کو کیا کہئے
دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
دکھ تو دیتا ہے کروں تجھ کو بھی حیراں تو سہی
مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
کب ہوس ہی مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کروں
کیا لگا لیتا ہے خوباں کو یقیں کرتی ہی داغ
جس کو منظور ہو جینا اُسے مرنا ہی عذاب
بے قراری کب ٹھہرنے دی ہی مجھ کو زیرِ تیغ
ستم ہی قید کرنا اس طرح کے مرغِ ناداں کو
کرتے ہیں اپنے بال دکھا مبتلا مجھے
جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر
خدا مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے
قیامت آپ پر اُس قد سو لا چکے ہم تو
اس بسنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجئے
نگاہ گرم سے کھا وبھی تاب مو کی طرح
یہ دل مملوک ہی خوباں کا کون اس کو چھپا رکھے

کبھو برا ہی ہمیں کہ ترا بھلا ہووے
نہ اُٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے
ولہ اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی
نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں ہو میں مچانے کی
ٹک اک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیریں دوانے کی
ولہ کیا کیا کیا یہ دل نے دیوانے کو کیا کہئے
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہئے
ولہ باغباں اب کے اجارے لوں گلستاں تو سہی
ولہ جی ہی لے چھوڑے گی آخر کو یہ بیماری مجھے
کھینچ کر لاتی ہے اس کوچہ میں ناچاری مجھے
آئینہ کی سادہ لوحی ساتھ پرکاری سے مجھے
ولہ ہے دمِ پاکِ مسیحا دمِ شمشیر مجھے
ولہ مارنا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے
ولہ کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے
ولہ اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے
کرتے تو کی یہ راست نہ آئی وفا مجھے
ولہ یہ خارِ خشک مگر آگ سے بہار کرے
کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے
ولہ جی میں ہے اک مصرع موزوں کو تضمین کیجئے
خدا کسی کے تئیں اتنا خوش کمر نہ کرے
ولہ بغل میں کون مالِ بادشاہی کو دبا رکھے

ولہ

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

دوستی بد بلا ہے اس میں خدا
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے

ہے وہ مقتول کافر نعمت
اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے

ناصحوں کی یہ کچھ نصیحت ہے
کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

ولہ

حسن اور عشق میں اک طور کی نسبت ہے ضرور
چشم بیمار تجھے دی ہے دل زار مجھے

یار آیا پہ مجھے ہوش نہ تھا کیا کیجے
نہ کیا اس دل دشمن نے خبردار مجھے

ولہ

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے
وصیت ہے ہماری خوں بھلا جلاد کو پہنچے

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں
مری فریاد بھی شاید مری فریاد کو پہنچے

ہمیں اس غم کی ہاتوں زندگانی خوش نہیں آتی
کوئی بیداد گر یارب ہماری داد کو پہنچے

ولہ

ہوا میں سرو کی اتنا نہ کر شور و شر اے قمری
نہ دے برباد تو اپنی کف خاکستر اے قمری

یقیں رکھیو کہ شوخی خوب نہیں خدمت میں خوباں کی
تو بیجا سرو کے چڑھ بیٹھے بیٹھے سر پہ اے قمری

ولہ

گئے سب بھول شکوے دیکھ روئے یار کیا کہئے
زباں حرف سے میری ہوئے بیکار کیا کہئے

تبسم میں جو اس کا منہ کھلا جی بندھ گیا اپنا
مرا دل لے گیا ہنستے ہی ہنستے یار کیا کہئے

اگر اس کی جگہ پہلو میں ہوتا چار بہتر تھا
بہت دیتا ہے میرا دل مجھے آزار کیا کہئے

یقیں کے واقعہ کی سن خبر وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ کچھ ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہئے

ولہ

دوانہ ہوں میں جی دینے میں مجنوں کے سلیقہ کا
مزے لے لے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے

گلا تو چھٹ گیا نے کیطرح فریاد کرنے سے
قیامت دور ہے کب تک ملے گی داد کیا جانے

نکل بھاگا ہے کوئی صید کیا اس دام سے سچ کہہ
کئی دن ہیں کہ تیری زلف کی خاطر پریشانی

ولہ

اگر زنجیر میری پاؤں میں ڈالے تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

ولہ

یہ وہ آنسو ہیں جن سے دہر آتشناک ہو جاوے
اگر بہوے کوئی یہ آب جل کر خاک ہو جاوے

گنہگاروں کو ہے امید اس اشک ندامت سے
کہ دامن شاید اس آب رواں سے پاک ہو جاوے

عجب کیا ہے تری خشکی کی شامت سے جو تو زاہد
نہال تاک پھیلا وے تو وہ مسواک ہو جاوے

وله
اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
مزا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے سجن خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیں کا شور جنوں سن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

وله
خوش آئی ہے مجھے یہ بات اُس مجنونِ عریاں سے
کیا کیجے کہاں تک چاک گذری ہم گریباں سے

وله
نہیں ہے جام مے بن کچھ ہمارا خونبہا ساقی
اس آبِ زندگی سے اپنے یاروں کو جلا ساقی

ٹک اک تو رحم کر اے مرگ مے کی تمنا میں
ہماری جان کو روتی ہیں یہ ابر و ہوا ساقی

وله
وفا کا کیا قیامت ہے کوئی بدلا جفا دیوے
ترحم ان بتوں کو اپنے بندوں پر خدا دیوے

وله
نہیں پرواز قسمت میں میری اُڑا
خفا ہو زندگی سے مر گیا ہوں لیک ڈرتا ہوں

مبادا حشر مجھ کو خوابِ راحت سے جگا دیوے

وله
محبت کا جو ناتا ہے عجب آداب ہیں اُس کے
کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں عاشق دعا دیوے

وله
نہ دے فرصت ان ہاتھوں سے کہ کچھ کام اور بھی نکلے
ہم آخر ہوں گے دامنگیر اس چاکِ گریباں کے

وله
رگڑنا ہے سر اپنا پشت پا پر متصل تیرے
گریباں پھاڑیئے اس پر کہ کیا طالع ہیں داماں کے

وله
ٹک اک انصاف کر کرتا ہے اتنی بھی جفا کوئی
کھوڑ صندل کھینچ ماتھے پر کیا ہے قتل عام

وله
تیغ ابرو کو دیا ہے سنگ دیکھا چاہیئے

۲- یکرنگ

یکرنگ تخلص، مصطفیٰ قلی خاں نام، متوطن شاہ جہان آباد کے۔ نواسوں میں خانجہان خاں لودی کے، اور معاصر شاہ نجم الدین آبرو کے تھے منصبداروں میں محمد شاہ بادشاہ، اور شہرۂ آفاق ساتھ عزت اُس ماہ کے، مشہور سخنوروں میں شاہجہاں آباد کے، اور معروف باں آوروں میں اس خجستہ بنیاد کے تھے۔ طور انکی گویائی کا پیرو قدما کی گفتگو کے ہے، اور طرز ان کے کلام کی روئیہ پر مضمون و آبرو کی ہے، لیکن ازبسکہ شیوہ سابق یاران حال کے غیر مرغوب ہے، تو آہنگ قدیم سمع خراش و دماغ کوب ہے۔ بلدہ شاہجہان آباد میں انہوں نے اس سرائے فانی سے سفر کیا اور دلوں پر احباب کے داغ حرماں کا دیا۔ یہ اشعار پُرمعنی و خوش بیان ان کے منتخب دیوان ہیں۔

مجھے مت پوچھ پیارے اپنا دشمن	ولہ	کوئی دشمن ہوا ہے اپنی جاں کا
میں روز و شب وصال سے تیری ہوں کامیاب	ولہ	کیونکر کہوں کہ تجھ سے بہتر ہے آفتاب
سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے	ولہ	راستے ہیں گے دار کی صورت
مجھ کو معلوم یوں ہوا گل سے	ولہ	پھول جاتے ہیں اُس سے دولتمند
کیوں کہے ہو تم کہو دشمن ہمارے اس قدر	ولہ	دوست کا دشمن کوئی ہوتا ہے پیارے اس قدر
نگہباں چاہیئے سرشار کے پاس	ولہ	تری آنکھوں سے کیونکر دل جدا ہو
رُوٹھتا ہوں اس سبب ہر بار میں	ولہ	تا گلے تیرے لگوں اے یار میں
اُس پری پیکر کو مت انسان بُوجھ	ولہ	شک میں کیوں پڑتا ہے اے دل جان بُوجھ
کیا جانئے وصال ترا ہو کسے نصیب	ولہ	ہم تو ترے فراق میں اے یار مر چلے
رونقِ اسلام تیرے رو سے ہے	ولہ	کفر کا رشتہ ترے گیسو سے ہے
بے قراروں کے تئیں آرام دل		اے مرے پیارے ترے پہلو سے ہے
جدائی سے تری اے صندلی رنگ	ولہ	مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
ہوا معلوم یہ غنچے سے ہم کو	ولہ	جو کوئی زردار ہے سو تنگ دل ہے
نہیں چھوڑیں ہیں سدا زلف تری اپنی مروڑ	ولہ	باوجودیکہ کمال ان میں پریشانی ہے
اب تو سجن ہمیں کو نباہی تمہیں سے ہے	ولہ	ہم سب طرف سوں یار تمہارے گلے پڑے
یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط	ولہ	رکھتا ہے یہ دو نین کہو تو نظر کرے
زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا	ولہ	گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم شامیوں کے ہاتھ		دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمانِ کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ		ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

بعون اللہ تعالیٰ کتاب تذکرۃ الشعرا من تالیف مرزا علی خاں لطف تخلص بتاریخ بست و ششم
ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۳۵ ہجری روز جمعہ بعد سہ پاس روز گذشتہ بہ اتمام رسید

اشتہار کتب جدید

مندرجہ ذیل کتب بغرض فروخت ہمارے پاس موجود ہیں
بذریعہ ویلیو پے ایبل پارسل یا نقد قیمت بھیجنے پر مل سکتی ہیں

۱- **الغزالی** مصنفہ شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی - اس کتاب کا پہلا اڈیشن ختم ہوچکا ہے - یہ دوسرا اڈیشن ہے قیمت عـگ

۲- **علم الکلام حصہ دوم** - مصنفہ شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی - حصہ اوّل سب بک چکا ہے اس کی کوئی جلد باقی نہیں - حصہ دوم کی صرف چند جلدیں باقی ہیں - قیمت عـ۱۲ر

۳- **تاریخ دکن** - جلد اول قیمت عـہ

۴- **تاریخ دکن** - جلد دوم - قیمت عـہ

۵- **تاریخ دکن** - جلد سوم - قیمت عـ۸ر

۶- **سفرنامہ تہینیو** - قیمت ۱۴ر

۷- **سفرنامہ ٹورنز** - قیمت ۶ر

۸- **نظام اکبری** - قیمت ۱۴ر

۹- **تمدن عرب** - شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کی مشہور کتاب قیمت سابق صـ
قیمت حال ملـ

۱۰- **حیات جاوید** قسم دوم مطبوعہ کانپور قیمت صہر

۱۱- **دربار اکبری** - مصنفہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد قیمت سـ ر

محصول ڈاک ہر حال میں بذمہ خریدار ہوگا

المشتہر

عبد اللہ خاں، کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد دکن

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔

[illegible]

۱۹۱۶۴۳۱۹

RR

۱۰۶

D 135

[illegible]